2

علمی و تحقیقی جریدہ

ششماہی

نور معرفت

رجب/ذوالحجۃ ۱۴۲۸ھ

اسلام آباد

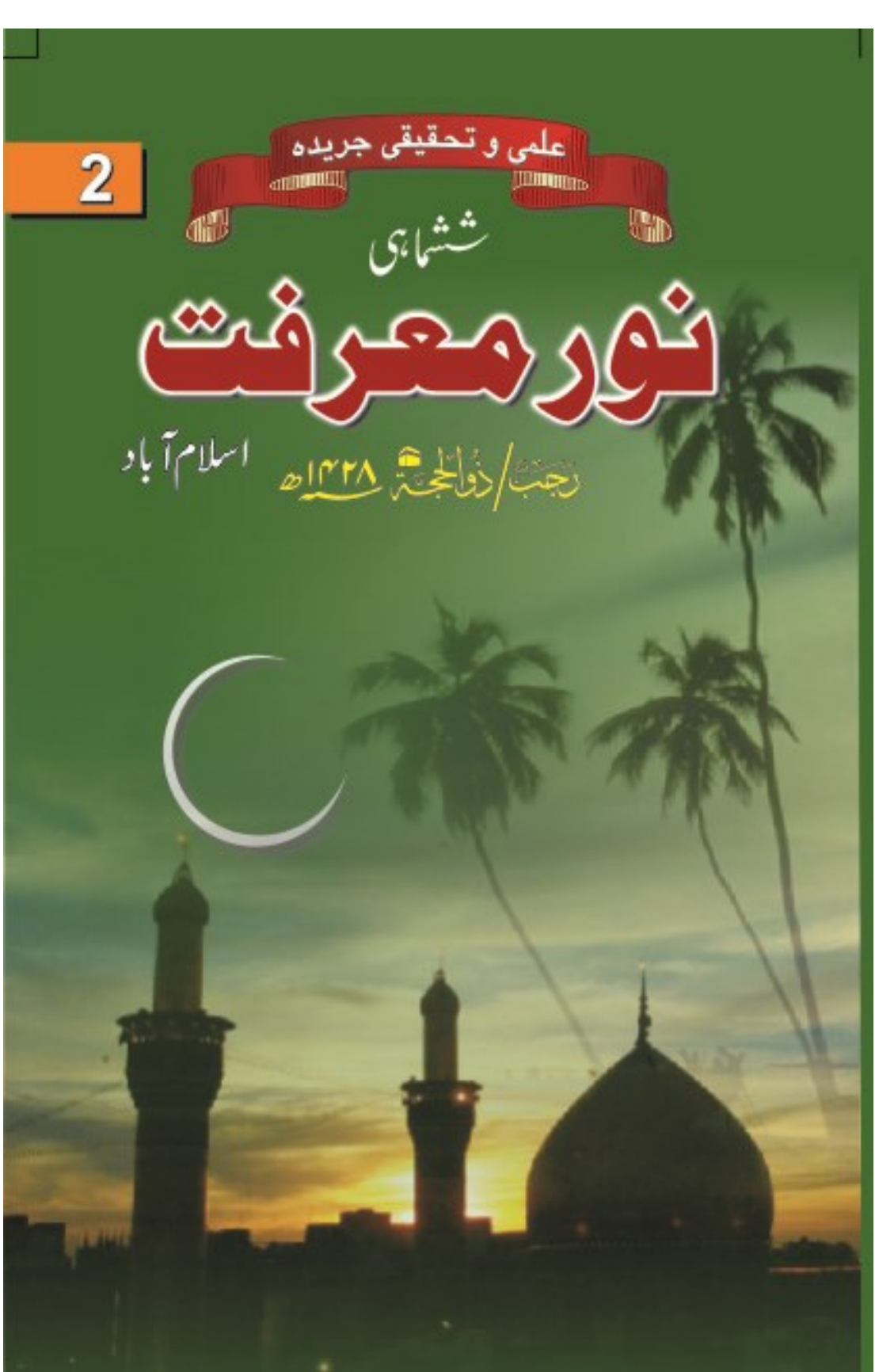

علمی و تحقیقی جریدہ

ششماہی نور معرفت، اسلام آباد

جلد ۱ | رجب تا ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ | شمارہ: ۲

صرف ممبران کے لئے

مجلس ادارت

سید حسنین عباس گردیزی — سید ثمر علی نقوی
محمد اصغر عسکری — سید محمد جعفر خوارزمی
سید فرحت علی کاظمی — جعفر علی میر

مجلس مشاورت

ڈاکٹر حسنین نادر — سید نثار علی ترمذی
اقرار حسین جعفری — ملک اعجاز حسین

مدیر

سید رمیز الحسن موسوی

پیشکش

جامعۃ الرضا، بہارہ کہو، اسلام آباد

نگران طباعت و سرکولیشن: علی طاہر حسینی

طابع و ناشر: نور الھدی ٹرسٹ اسلام آباد

فرمانِ الٰہی:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـؤُا نُوْرَ اللهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ { الصّف۔8 }

یعنی: "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نور خدا کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے؛ چاہے یہ بات کفار کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔"

****

حدیث نبوی:

انی تارک فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلو ابدا وانهما لن یفترقا حتیٰ یردا علیّ الحوض

ترجمہ: "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں۔ کتاب خدا اور میری عترت اہل بیتؑ؛ اگر تم نے ان کا دامن تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔"

(صحیح مسلم: ۱۲۲/۷؛ سنن دارمی: ۴۳۲/۲؛ مسند احمد: ج ۳، ۱۷، ۱۴۔ ۴، ۵۹، ۳۶۶/۲۶۔ ۳۷۱ ۱۸۲/۵۔ اور مستدرک حاکم: ۱۰۹/۳۔ ۵۳۳، ۱۴۸۔ وغیرہ)

****

رہبر انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای فرماتے ہیں:

" امّت، بلکہ انسانیت کے لئے یہ درس ہے کہ وہ صاحب علم، قوی اور بہادر ہوں۔ اخلاقیات اور انسانی کرامت کا پاس اور لحاظ رکھیں۔ آپس میں ہمدرد ومہربان اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم اور باعزت مجاہد بنیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ رسول اکرمؐ نے ہمیں اخلاق، عزت، تحصیل، علم، رحمت وکرامت، اور وحدت کے بارے میں جو تعلیمات دی ہیں اور جو ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں انہیں ہم اپنی زندگی میں شامل کریں۔"

****

فہرست مطالب

نمبر شمار	موضوع	مقالہ نگار	صفحہ
.1	اداریہ: دینی مدارس اور عصری تقاضے	سید رمیز الحسن موسوی	4
.2	عروج وزوال اُمّت، قرآن کی روشنی میں	حجۃ الاسلام سید حسنین عباس گردیزی	7
.3	حدیث الغدیر (من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ) از نظر محقق اسماعیل دیوبندی	ابواسد	19
.4	توحید عملی اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات	حجۃ الاسلام سید ثمر علی نقوی	51
.5	امامت وخلافت، علم کلام کا ایک اہم باب	حجۃ الاسلام محمد اصغر عسکری	67
.6	فقہ اہل بیت میں بچوں کے حقوق	سید رمیز الحسن موسوی	78
.7	ارسال الیدین: ''نماز میں ارسال الیدین کے جواز اور تکتف کی حرمت کے بارے میں ایک تحقیق''	ابن ذاکر موسوی	90
.8	دعائے ندبہ: اسناد اور تعلیمات کی روشنی میں	حجۃ الاسلام سید حسنین عباس گردیزی	110
.9	التبیان فی تفسیر القرآن	سید رمیز الحسن موسوی	127
.10	علمائے امامیہ کی اردو زبان میں تفسیری خدمات	جناب سید نثار علی ترمذی	133

اداریہ

دینی مدارس اور عصری تقاضے

Religious Madaris and Modern Requirements

عصر حاضر میں دینی مدارس کے لیے تین امور انتہائی ضروری ہیں: ایک، تحول و تبدل؛ دوم، عمق و گہرائی؛ سوم، وسعت اور پھیلاؤ۔ **تحول و تبدل** اس لیے ضروری ہے: چونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ انواع واقسام کی تبدیلیاں وجود میں آرہی ہیں، لہٰذا دینی مدارس کو اپنا یہ دعویٰ ثابت کرنے کے لیے کہ دین اسلام ایک جاودانی دین ہے اور ہر زمانے کی ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، زمانے کی رفتار کے ساتھ اپنی رفتار بھی بڑھانی ہوگی اور زندگی میں جس قدر تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں، ان کے ساتھ اپنے آپ کو بھی تبدیل کرکے شرعی مسائل کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوگا۔

عمق و گہرائی اس لیے ضروری ہے کہ یہ زمانہ پیچیدہ ترین مسائل کا زمانہ ہے جن کے حل کے لیے جہاں دین نے گہرے اور عمیق معارف پیش کیے ہیں، وہاں دین کے داعیوں کو بھی سطحی نظر سے ہٹ کر گہرائی اور عمق اختیار کرنا پڑے گا، ورنہ زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنا مشکل ہو جائے گا۔ **وسعت و پھیلا** اس لیے لازم ہے کہ زمانہ حاضر میں انسانوں کی ضروریات اور احتیاجات بھی پھیل چکی ہیں۔ آئے دن نئے سے نئے موضوعات سامنے آرہے ہیں۔ انواع اقسام کے مسائل درپیش ہیں۔ لہٰذا جتنے موضوعات زیادہ ہوں گے، اسی قدر ان کے احکام میں بھی وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔ ان سب باتوں کے علاوہ دشمن کی طرف سے پروپیگنڈے میں اس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ شاید گزشتہ زمانے میں جو پروپیگنڈہ ایک سال کے عرصے میں کیا جاتا تھا، وہ اب ہفتوں اور دنوں میں کیا جانے لگا ہے اور اس وقت دین اسلام اور مکتب اہل بیتؑ جس قدر زہریلے پروپیگنڈے کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ شاید تاریخ کے کسی دوسرے دور میں ایسا پروپیگنڈہ نہ کیا گیا ہو۔ اور پھر اس پروپیگنڈے اور شبہات و اعتراضات میں بھی ایک خاص قسم کی پیچیدگی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا جو شخص یا ادارہ اور دینی مرکز اس قسم کی پیچیدگی اور گہرائی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ اس کے مقابلے میں دین کا دفاع بھی نہیں کر سکتا۔

دوسری طرف جہاں اہل کفر و نفاق کی یلغار میں اضافہ ہوا ہے اور پیچیدگی و گہرائی پیدا ہوئی ہے؛ وہاں صدیوں سے فکری، روحانی اور جسمانی و مادی لحاظ سے پسے ہوئے انسان کو بھی پناہ گاہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

لہٰذا انسانوں کا ایک ہجوم ہے کہ جو دین اسلام اور روحانیت ناب کی طرف اُمڈتا چلا آرہا ہے۔ گذشتہ بیس سالوں میں جس قدر ستم دیدہ انسانوں نے اسلام کی پُرامن آغوش میں پناہ لی ہے، اس قدر شاید پچھلے دو سو سال میں بھی نہیں لی۔ خصوصاً اس سلسلے میں مکتب اہل بیت اطہارؑ کی طرف مسلموں اور غیر مسلموں کا رجوع بہت زیادہ ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے کہ جب مشرقی بلاک شکست سے دوچار ہوتا ہے اور کیمونزم کے بے بنیاد پروپیگنڈے کا پول کھلتا ہے اور اسلام ایک دم تمام استعماری اور استکباری تہذیبوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور مغربی بلاک کی تمام شیطانی قوت ایک جگہ متمرکز ہو جاتی ہے۔ اور پھر نائن الیون کے بعد تو یہ کیفیت اور بھی شدت اختیار کر لیتی ہے اور کفر و نفاق کا کٹھ جوڑ دنیائے اسلام کو تباہ کرنے کے لیے میدان کارزار میں اُتر جاتا ہے اور عراق و افغانستان جیسے دو اہم ترین مسلمان ملک کفر نفاق کے اس اتحاد کا نشانہ بنتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی پاکستان عزیز پھر بھی عالمی استکباری سازشوں کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو اس وقت حقیقی اسلام کے ماننے والے ثقافتی اور عسکری یلغار کے سامنے اپنے آپ کو تن تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

یہاں سے دینی مدارس کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جنہیں اب بے حس سے بے حس انسان بھی محسوس کرتا ہے اور اس کی نظریں فقط و فقط دینی قوتوں، دینی اداروں اور مدارس کی طرف اٹھتی ہیں۔ اس کی دوسری بڑی دلیل یہ ہے کہ دشمنان اسلام اس چیز کو ہم سے پہلے سمجھ جاتے ہیں اور پہلے سے دینی مدارس کے کردار کو مشکوک بنانے کی منصوبہ بندی شروع کر دیتے ہیں اور نام نہاد دینی اداروں کے ذریعے حقیقی دینی اداروں کی افادیت کو زیر سوال لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آبادی میں بے پناہ اضافے نے بھی دینی مدارس کی وسعت اور پھیلاؤ کے تقاضے کو مزید بڑھا دیا ہے اور آبادی کے تناسب سے ملک میں دینی مدارس کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے لیکن کمیت میں اضافے کے ساتھ کیفیت میں اضافہ نہیں ہو سکا جو ہمارے دینی مدارس کا زمانے کی رفتار سے ہم آہنگ نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

مذکورہ بالا تمام نکات کے پیش نظر اگر دینی مدارس اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتے ہیں ، کیفیت و کمیت کے لحاظ سے اپنی گزشتہ چال کے مطابق ہی چلتے ہیں، زمانے کی رفتار کے مطابق قدم نہیں اُٹھاتے اور عصر حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کو مد نظر نہیں رکھتے تو انہیں بہت جلد بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور شاید یہ مشکلات اب شروع ہو چکی ہیں۔ اور اسلام کا سفینہ ہم داعیان اسلام کی غفلت، کاہلی اور زمان و مکان کے تقاضوں سے بے بہرہ رفتار کی وجہ سے متزلزل ہے۔ یہاں اسلام کے متزلزل ہونے سے یہ مراد نہیں کہ خود دین اسلام

خطرے میں ہے۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ اگر پوری دنیا بھی اسلام سے منہ موڑلے اور خدا کی خدائی کا انکار کر دے تو خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور دین پر کسی قسم کی آنچ نہیں آئے گی۔ بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ اسلام کے ماننے والوں کا اسلام پر ایمان خطرے میں ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ موجود دور میں ''مذہبی مسائل''، سیاسی مسائل کے ساتھ کچھ اس طرح مخلوط ہو چکے ہیں کہ دشمن اپنے سیاسی مسائل کی خاطر مذہبی مسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی جدید مذہب بنائے جاتے ہیں، کبھی حقیقی مذہب کی تعلیمات کو بگاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی اسلام ناب محمدیؐ کے مقابلے میں امریکی اسلام کو لایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا کہ جس کی طرف امام خمینیؒ نے اُمت مسلمہ اور خصوصاً دینی مدارس کو بارہا متوجہ کرنے کی کوشش کی اور دینی مدارس کو دشمن شناسی کی تاکید کی ہے۔

یہ وہ مسائل ہیں کہ جن کے بارے میں دینی مدارس کے ہر ذمہ دار انسان کا فکر مند ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اگر ہم ان مسائل و مشکلات کو محسوس کرنے کے باوجود اپنی رفتار اور زمانے کی رفتار میں ہم آہنگی پیدا نہیں کرتے تو ہم اپنے ہاتھوں سے عظیم اسلامی تمدن کو تباہ کر رہے ہیں کہ جس کی پہلی بنیاد یہی دینی مدارس اور ادارے ہیں۔ چونکہ دینی مدارس وعلمائے دین کے بغیر حقیقی اسلام کا تصور محال ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں امام خمینیؒ فرماتے ہیں: '' بغیر علماء کے اسلام ایسے ہی ہے جیسے کوئی مملکت بغیر طبیب کے ہو۔۔۔ یہ حوزہ ہائے علمیہ ہیں جو ابھی تک اسلام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اگر علمائے دین نہ ہوتے تو آج اسلام کا نام ونشان نہ ہوتا۔''

مدیر مجلّہ

عروج وزوال اُمت، قرآن کی نظر میں

The Rise and Fall of *Ummah* from Quranic Perspective

حجۃالاسلام سید حسنین عباس گردیزی

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے۔ اس میں بہت سارے موضوعات پر گفتگو اور بحث کی گئی ہے۔ان موضوعات میں سے ایک اہم موضوع گذشتہ اقوام اور معاشروں کے حالات ہیں۔ قرآن حکیم کا ایک بڑا حصہ گذشتہ معاشروں اور قوموں کی داستان اور واقعات پر مشتمل ہے۔ اس موضوع پر قرآن نے واقعات اور سرگذشتوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اقوام کی ترقی اور زوال کے اصول و قوانین بھی بیان کیے ہیں جو اپنے اندر آئندہ اقوام اور معاشروں کے لیے ہدایت کا عنصر لیے ہوئے ہیں۔قرآن حکیم نے ان اصول و قوانین کے لیے ''سنت '' یا'' سنن '' کی تعبیر استعمال کی ہے ۔ ''سنن '' سنت کی جمع ہے۔لغت میں اس کا معنی روش ، طریقہ ۔اسلوب ، طبیعت اور شریعت بیان کیا گیا ہے: مفسرین نے بھی لغوی معنی سے ہم آہنگ معنی مراد لیے ہیں علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں سنت کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :السنن جمع وهی الطريقه المسلو كه فی المجتمع یعنی: "سنن، سنت کی جمع ہے اور اس سے مراد معاشرے کا وہ طریقہ کار ہے جس پر وہ چلتا ہے۔ ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں: والسنة هی الطريقة والسيرة [1] یعنی: "سنت معمول اور رائج طریقے کو کہتے ہیں۔" قرآن مجید میں دس سورتوں کی گیارہ آیات میں سولہ ۱۶ مرتبہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد انسان اور انسانی معاشرے کے متعلق خالق کائنات کی تبدیل نہ ہونے والی دائمی روش اور طریقہ کار ہے۔ ارشاد خداوندی ہے :

- قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ [2]

ترجمہ : ''تم سے پہلے کچھ سنتیں گزر چکی ہیں اب تم زمین میں گھوم پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔''

قرآن مجید ان سنتوں میں تغیر و تبدل کے امکان کو رد کرتے ہوئے فرماتا ہے:

- وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[3]

ترجمہ: اگر یہ کفار تم سے جنگ کرتے تو یقینا منہ پھیر کر بھاگ جاتے اور پھر انہیں کوئی سرپرست اور مددگار نصیب نہ ہوتا یہ اللہ کی ایک سنت ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے اور تم اللہ کے طریقے میں ہر گز کوئی تبدیلی نہیں پاؤگے۔

قرآن مجید میں ان سنن کی ایک خاصیت ان کا عمومی اور بین الاقوامی ہونا بیان ہوئی ہے:

- سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[4] ترجمہ: "یہ خدائی سنت ان لوگوں کے بارے میں رہ چکی ہے جو گذر چکے ہیں اور تم الٰہی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤگے۔" اسی آیت سے ان اصول و قوانین (سنن) کا دائمی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے اب قرآن اصول و قوانین کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف دیتا ہے اور اس رو سے انہیں سنن الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

امت کے لیے حیات اور موت کا تصور

قرآن کی نظر میں ایک فرد کی طرح ہر امت اور معاشرے کی زندگی کے مختلف مراحل ہیں، ہر ایک کا انجام مشخص و معین ہے۔ دورانیہ اور مدت معلوم ہے، اس کا دوام اور بقاء بھی معلوم ہے اور اس کے کردار اور خصوصی نامہ اعمال کا بھی ایک معیار ہے۔ ان مراحل کے گزرنے کے بعد آخر کار اس کی بساط زندگی لپیٹ دی جاتی ہے اور وہ قصہ پارینہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید متعدد آیات میں قوموں کی حیات اور موت کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن اس سنت الٰہی کو بیان کرتا ہے کہ ہر امت اور ملت کے لیے خاص پروگرام ہے جس میں اس کا مطلوب یا نا مطلوب کردار، اس کی زندگی کی مدت اور موت کا وقت، اسی طرح اس کے زوال کے اسباب مندرج ہیں۔ جس کا علم پروردگار کے پاس ہے:

- وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ: فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ[5]

ترجمہ: "ہر قوم کے لیے ایک مدت معین ہے۔ جب بھی ان کی مدت ختم ہو جائے گی تو اس سے وہ لوگ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، نہ آگے بڑھ سکیں گے۔"

- وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ[6]

ترجمہ: " اور ہم نے کسی بستی والوں کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لیے میعاد مقرر کر دی تھی کوئی اپنے وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے۔ "

- وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا[7]

ترجمہ: "اور کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جسے ہم نے قیامت سے پہلے برباد نہ کریں یا اس پر شدید عذاب نہ نازل کر دیں کہ یہ بات کتاب میں لکھ دی گئی ہے۔"

امتوں کا عروج وزوال

اقوام عالم اور انسانی معاشروں سے متعلق دوسری خصوصیت جسے قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہ ان کا عروج وزوال ہے۔ ہر قوم اور امت کے لیے ایک عروج ہے اور پھر زوال کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سنت الٰہی کو یوں پیش کیا گیا ہے:

- قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ

ترجمہ: "تم سے پہلے روشیں گزر چکی ہیں اب تم زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔"

- هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ[8]

ترجمہ: "یہ عام انسانوں کے لیے حقائق ہیں اور صاحبان تقویٰ کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔ آگاہ ہو جاؤ، تم سستی اختیار نہ کرنا اور مصائب پر محزون نہ ہونا۔ اگر تم صاحب ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لیے ہے، اگر تمہیں کوئی تکلیف چھو لیتی ہے تو دوسری قوم کو بھی اس سے پہلے ایسی ہی تکلیف پہنچ چکی ہے اور ہم تو زمانے کو لوگوں کے درمیان الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں تاکہ خدا صاحبان ایمان کو دیکھ لے اور تم میں سے بعض کو شہدا قرار دے اور وہ ظالمین کو دوست نہیں رکھتا ہے اور خدا صاحبان ایمان کو چھانٹ کر الگ کر دینا چاہتا ہے اور کافروں کو مٹا دینا چاہتا ہے۔"

اسی طرح سورہ یونس کی آیت نمبر ۳ اور ۴ اور سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۱۴ میں اسی مطلب کو واضح کیا گیا ہے۔

عروج وزوال کے عوامل

قرآن مجید اُمتوں کی عزت وسر بلندی اور ذلت و پستی کے حقیقی علل واسباب کو بیان کرتا ہے۔قرآن ہماری اس طرف راہنمائی کرتا ہے کہ ان علل واسباب کو تلاش کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ تم آسمانوں اور زمین میں ان کا کھوج لگاؤ ، انہیں قدرت اور طبیعت وعالم میں تلاش کرو بلکہ انہیں اپنے اندر ڈھونڈو اور اس کی اپنے درمیان جستجو کرو۔ تم انہیں اپنے فکر و نظر، عقیدے، اخلاقی اور معاشرتی نظام کی بنیادوں میں تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ تم اپنی ان چیزوں میں غور فکر کرو۔ وہ قومیں جو تفکر وتدبر کو بروئے کار لائیں، اخوت وبرادری اور اتحاد کا دامن تھاما، اپنی اصلاح کے لیے پختہ عزم وارادے سے کوشش کی، وہ ترقی کی بلندیوں پر پہنچیں اور جب تلاش و کوشش کی جگہ سستی اور جمود نے لے لی، جب غفلت اور جہالت علم وآگہی کی جاگزین ہوئی۔ پاکیزگی اور تقویٰ کے مقام پر آلودگیاں اور برائیاں آگئیں۔ تفرقہ اور گروہ بندی نے اتحاد واخوت کو پارہ پارہ کر دیا تو اس صورت حال میں فکر و نظر، اعمال اور رویوں میں اس نامطلوب تبدیلی کا نتیجہ شکست وانحطاط کی صورت میں نکلا۔

قرآن ایک کلی قانون اور اصول بیان کرتا ہے جو اقوام عالم اور انسانی معاشرے کے متعلق اسلام کی نظر اور رائے کو واضح کرتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ تمہاری تقدیر ہر عامل سے پہلے اپنے تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ امتوں میں ہر قسم کی ترقی اور زوال ، معاشروں کی عظمت و ذلت پہلے مرحلے میں خود ان کی طرف لوٹتی ہے۔ بخت ،اقبال، اتفاقات ، حادثات، ملکی حالات اور اس طرح کی دیگر چیزیں معاشروں کے عروج و زوال میں ہر گز بھی موثر نہیں ہیں۔ ان میں کوئی امر بھی امتوں کی ترقی زوال کی بنیاد نہیں بنتا یہ خود امت اور معاشرہ ہے جو اپنی خوشحالی خوش بختی اور ترقی وعروج کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے یا اپنی ہلاکت اور تباہی کو دعوت دیتا ہے اور اس کے اسباب مہیا کرتا ہے یہاں تک کہ لطف الٰہی اور عذاب الٰہی بھی معاشروں اور اقوام کے حالات کو مد نظر رکھے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ معاشروں اور اقوام کے اپنے ارادے اور خواہشات ہیں اور ان کے اندر ہونے والی پسندیدہ اور ناپسندیدہ تبدیلیاں ہیں جو انہیں رحمت الٰہی یا عذاب الٰہی کا مستحق بنادیتی ہیں۔

قرآن کریم مختلف عنوانات اور مختلف مناسبتوں سے اس سنت کو بیان فرماتا ہے کہ معاشرتی تبدیلیاں اور اجتماعی انقلاب ،افراد اور معاشروں کی اندرونی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔اس دائمی سنت کو متعدد آیات

میں موضوع سخن قرار دیا گیا ہے جنہیں چند جزئی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے:

ا۔ انقلاب اپنے اندر سے

قرآنی آیات کا حصہ اس حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ اگر قومیں اور امتیں اپنے حالات کو بدلنا چاہتی ہیں اپنے اندر اجتماعی سطح پر بہتری اور ترقی کی خواہاں ہیں انہیں ادھر اُدھر نہیں دیکھنا چاہیے، انہیں بیرونی امداد پر امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہیں۔ ان کی نظریں بیرونی دنیا پر نہیں ہونا چاہئیں بلکہ انہیں تبدیلی کا آغاز اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔ اپنی اندرونی حالت کو بدلنا چاہیے کیونکہ ہر قسم کی اجتماعی تبدیلی، اندرونی تبدیلیوں کی مرہون منت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ[9] ترجمہ: بے شک اللہ کسی قوم کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔

دوسرے مقام پر قرآن کریم فرعونیوں کے اوج قدرت اور شان و شوکت کے بعد عبرتناک زوال کو ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ وَاَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ[10] ترجمہ: "(مشرکین کے) اس گروہ کی حالت آل فرعون اور ان سے پہلے والوں کی طرح ہے انہوں نے آیات الٰہیہ کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان گناہوں کے سبب گرفت میں لے لیا کہ اللہ قوی بھی ہے اور سخت عذاب دینے والا بھی۔ یہ اس لیے کہ خدا کسی قوم کو دی ہوئی نعمت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے تئیں بدل نہ دیں۔ بے شک اللہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔"

۲۔ عمل اور رد عمل

آیات کی یہ قسم اس واقعیت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ ہر امت اور معاشرے کی سعادت یا ہلاکت ان کے شائستہ یا مناسب عمل و کردار کا نتیجہ ہے۔ اس سعادت اور ہلاکت کی بازگشت قوانین اور سنن الٰہی کی روشنی میں خود انہی کے کردار و عمل کی طرف ہوتی ہے۔ سعادت و خوش بختی اور اسی طرح ذلت و رسوائی اور ہلاکت و تباہی ان کے اعمال کا رد عمل ہے اور یہ ایک کلی اصول ہے جو تمام معاشروں اور اقوام کے درمیان کارفرما ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

- اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا[11]

ترجمہ: "اگر تم نیک عمل کروگے تو اپنے لیے اور بُرا کروگے تو بھی اپنے لیے۔"

- عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا[12]

ترجمہ: "امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں بخش دے لیکن اگر تم نے دوبارہ خرابی کی تو ہم سزا دیں گے۔"

- مَنْ کَفَرَ فَعَلَیْہِ کُفْرُہٗ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِہِمْ یَمْہَدُوْنَ [13]

ترجمہ: "جو کفر کرے گا وہ اپنے کفر کا ذمہ دار ہوگا اور جو نیک عمل کرے گا وہ اپنے لیے راہ ہموار کرے گا۔"

- مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْہَا[14]

ترجمہ: "جو بھی نیک عمل کرے گا وہ اپنے لیے کرے اور جو بُرا کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا۔"

- قُلْ یٰعِبَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّکُمْ۔ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ[15]

ترجمہ: "کہہ دیجیے کہ اے میرے ایمان دار بندو۔ اپنے پروردگار سے ڈرو۔ جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لیے اچھائی ہے۔"

۳۔ انسانی اعمال کے مقابلے میں عالم طبیعت کا ردعمل

آیات کا یہ حصہ جہاں، عالم طبیت کے اجزاء وذات کے خصوصی شعور وادراک پر دلالت کرتا ہے۔ وہاں انسان اور عالم طبیعت کے درمیان ایک خاص قسم کے رابطے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور اس رابطے کو سنت الٰہی کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ ارشاد پروردگار ہے: وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ[16] ترجمہ: " اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لیے زمین اور آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے انہیں ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا۔" ایک اور جگہ ارشاد ہوا: وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِیْقَۃِ لَاَسْقَیْنٰھُمْ مَّآءً غَدَقًا[17] ترجمہ: "اور اگر یہ سب لوگ ہدایت کے راستے پر ہوتے تو ہم انہیں وافر پانی سے سیراب کرتے۔"

۴۔ ہر امت اور معاشرہ اپنے عمل کا گروی ہے

اس حقیقت کو قرآن نے "عمل"، "کسب" اور "سعی" جیسے الفاظ سے واضح کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ[18] ترجمہ: " یہ قوم تھی جو گزر گئی انہیں وہ ملے گا جو انہوں نے کمایا اور تمہیں وہ ملے گا جو تم کماؤ گے۔" نیز ارشاد ہوا: وَکَذٰلِکَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ[19]

ترجمہ : "اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو ان کے اعمال کی بنا پر بعض پر مسلط کر دیتے ہیں۔" ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی[20] ترجمہ : " اور انسان کے لیے اتنا ہے جتنی اس نے کوشش کی۔"

۵۔فلاح ونجات تزکیہ اور تعمیر کردار میں ہے

آیات کی پانچویں قسم یہ اصول بیان کرتی ہے کہ ہر فرد کی دنیاوآخرت میں فلاح ونجات اقدار کی پاس داری اور اس کے متضاد امور سے پاکیزگی اور طہارت میں مضمر ہے۔ دلوں کی پاکیزگی، نفوس کی طہارت، نظریات و افکار کی پاکیزگی، گفتار و کردار کا طاہر ہونا ہی کامیابی کا ضامن ہے اور اسے بقاو دوام حاصل ہو سکتا ہے۔انبیاالٰہیٰ کا عظیم فریضہ افراد اور معاشرہ کو ہر قسم کی آلودگیوں اور پلیدگیوں سے پاک کرنا اور انہیں طاہر بنانا ہے۔ اس مطلب کو قرآن مجید نے مختلف مقامات پر بیان فرمایا:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا

ترجمہ : "بے شک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کر دیا۔"

اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ہلاکت، ذلت وخواری ان کا مقدر ہو گی اس حقیقت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ بِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِی النَّاسِ لِيُذِيۡقَهُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ قُلۡ سِيۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّشۡرِكِيۡنَ[21]

ترجمہ : "لوگوں کے اعمال کے باعث فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا تاکہ خدا انہیں ان کے کچھ اعمال کا مزاچکھا دے۔ شاید یہ لوگ راستے پر پلٹ آئیں آپ کہہ دیجیے کہ ذرا زمین میں گھوم پھر کر دیکھو کہ تم سے پہلے والوں کا کیا انجام ہوا جن کی اکثریت مشرک تھی۔"

۶۔امتوں کے انحطاط اور ترقی کے عوامل

امتوں کا انحطاط اور ترقی پہلے مرحلے پر ان کے خالق کائنات کے ساتھ ارتباط کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر کسی امت نے اپنے پروردگار کی صحیح معرفت حاصل کی، فکر و نظر اور عملی لحاظ سے اس پر ایمان لے آئی اور صراط مستقیم کو اپنے لئے منتخب کیا اور تقویٰ کو اپنا شعار بنایا تو ایسی امت یقیناترقی کرے گی۔اور اگر حق کا انکار کیا اور آیات الٰہی کے مقابلے پر سرکشی کی تو زوال و سقوط اس کا مقدر ہو گا۔ قرآن اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ وحی کی تکذیب، ہٹ دھرمی اور عناد و کفر اختیار کرنا، آیات الٰہی کے سامنے متکبرانہ رویہ اپنانا اور ان کے مقابلے میں سرکشی کرنا، حق سے روگردانی، معبود حقیقی اور یکتا کے علاوہ کسی کو سرپرست اور معبود بنانا،

مشرکانہ عقائد رکھنا اور عملی طور پر شرک کرنا، پیغمبروں کی تحریک اور تعلیمات کے سامنے سر کشی اور ان کے خلاف ڈٹ جانا، عصیان، گناہ، برائیوں کا رواج اور ہوا پرستی، امتوں اور معاشروں کے انحطاط کے موجب ہیں۔ اب ان عنوانات کے بارے میں قرآن کی چند آیات بیان کی جاتی ہیں۔

ا۔ تکذیب آیات

آیات قرآنی کا ایک حصہ تکذیب آیات عناد و تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کفر کا راستہ اختیار کرنے کو انحطاط و تنزل کا سبب قرار دیتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے: سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ترجمہ: "یہ اس قوم کی مثال ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ پس آپ ان قصوں کو بیان کریں شاید یہ غور و فکر کرنے لگیں کس قدر بُری مثال ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور وہ لوگ اپنے ہی نفس پر ظلم کر رہے تھے۔" سورہ قمر میں بعض اُمتوں اور ان کے پیغمبروں کے حالات اور اُمتوں کی طرف سے ان کی تکذیب اور اس کے نتیجے میں ان کے عبرتناک انجام کو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے: كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ[22] ترجمہ: اور قوم عاد نے جھٹلایا تو ہمارا عذاب اور ڈرانا کیسا رہا؟ ہم نے ان پر تند و تیز آندھی بھیج دی ایک مسلسل نحوست والے منحوس دن میں۔

۲۔ وہ آیات جو قرآن کے سامنے مستکبرانہ رویوں کو زوال کا عامل گردانتی ہیں

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ[23] ترجمہ: اور قارون و فرعون و ہامان کو بھی یاد دلاؤ جن کے پاس موسیٰ کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو ان لوگوں نے زمین میں استکبار سے کام لیا حالانکہ وہ ہم سے آگے بڑھ جانے والے نہ تھے۔ پھر ہم نے ہر ایک کو اس گناہ میں گرفتار کر لیا۔

۳:۔ غیر خدا کو اپنا سرپرست اور ولی بنانا

قرآن مجید سورہ عنکبوت میں بعض سر کش اور نافرمان امتوں کے دردناک اور افسوس ناک انجام کو بیان کرنے کے بعد ایک خوب صورت اور گویا مثال کے ذریعے ایک کلی اصول بیان کرتا ہے کہ جو اُمت خدائے واحد کے علاوہ کسی اور کو اپنا ولی سرپرست مانے گی، در حقیقت اس نے کمزور ترین سہارا ڈھونڈا

ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔۔۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ [24] ترجمہ : "وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا سرپرست بنائے وہ مکڑی کی طرح ہیں جس نے گھر بنایا اور کمزور ترین گھر مکڑی کا ہے۔ اگر یہ لوگ جانتے ہوتے۔۔۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے دیتے ہیں اور ان میں غور وفکر نہیں کرتے مگر علماء۔"

۴۔ بنیادی ترین عامل "ظلم" ہے

عدل وانصاف کے راستے سے انحراف اور ظلم وستم کا ارتکاب امتوں کے زوال اور ہلاکت کا بنیادی ترین عامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ سنت کی تائید گہرے عقلی اور معاشرتی اصولوں کے ساتھ ساتھ تاریخی تجربات اور واقعات بھی کرتے ہیں۔ قرآن کی بہت سی آیات اس حقیقت کو روشن کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ [25] ترجمہ : "بتحقیق ہم تم سے پہلے کئی امتوں کو جب انہوں نے ظلم کیا، ہلاکت سے دوچار کر چکے ہیں۔ ان کے پاس روشن دلائل کے ساتھ ان کے رسولؑ آئے اور وہ ایمان نہیں لائے۔ اور ہم اسی طرح مجرم قوم کو سزا دیا کرتے ہیں۔" ایک اور مقام پر ارشاد ہے: وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ [26] ترجمہ : " ہم نے کتنے شہروں اور آبادیوں کو ان کے ظلم کی بنا پر تباہ وبرباد کیا اور ان کے بعد دوسری قوم کو وہاں آباد کیا۔" نیز فرمایا: وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ [27] ترجمہ : "ہم نے کسی شہر اور آبادی کو نابود نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے باسی ظالم اور ستم گر تھے۔" اسی طرح قرآن مجید کی دیگر متعدد آیات اقوام عالم کے ظلم وستم اور ان کے عدل وانصاف کو پائمال کرنے کو ان کی ہلاکت اور نابودی کا عامل بتاتی ہیں۔ [28]

۵۔ اجتماعی فریضے سے غفلت

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دعوت الی الحق کا ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اس کے ذریعے سے فرائض الٰہی قائم ہوتے ہیں اور برائیوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار کی ترویج ہوتی ہے اور انسانیت کے خلاف اور معاشروں کی تعمیر وترقی میں رکاوٹ بننے والے امور کی روک تھام ہوتی ہے۔ قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کی عظمت اور شخصیت کو بیان فرماتا ہے: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ

عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ [29] ترجمہ: "یہ نبی انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے۔ برائی سے روکتا ہے پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال قرار دیتا ہے۔ ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے کاندھوں سے بوجھ ہلکا کرتا ہے اور تمام طوق زنجیروں سے انہیں رہائی دلاتا ہے جنہوں نے ان کے جسم اور فکر کو جکڑ دیا تھا۔"

قرآن مجید بہترین اُمت کے عنوان سے ایسی اُمت کا تعارف کراتا ہے جو ہمیشہ اپنی اصلاح و خودسازی کے ساتھ ساتھ دوسرں کی اصلاح و بھلائی کے لیے حق کی دعوت دیتی ہے، اچھائیوں کا حکم دیتی ہے اور غیر انسانی اقدار کو معاشرے میں پھیلنے سے روکتی ہے اور پلیدگیوں اور گناہوں کے خلاف اچھے انداز میں جہاد کرتی ہے: كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ترجمہ: "تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کو معروف کا حکم دیتی ہو اور منکرات سے منع کرتی ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہے۔" آخر کار حقیقی کامیابی اور فلاح ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو معاشرے میں نماز کو برپا کریں گے۔ لوگوں کے مالی حقوق ادا کریں گے اور معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ کریں گے اور نیکیوں کو رواج دیں گے۔ ارشاد رب العزت ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ [30] ترجمہ: "وہ لوگ ایسے ہیں کہ جنہیں جب ہم زمین پر صاحب اقتدار بنا دیا تو انہوں نے نماز قائم کی، زکوۃ ادا کی؛ نیکی کا حکم دیا اور بدی سے روکا اور ہر چیز کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہی ہے۔"

۶۔ تفرقہ اور اختلاف

ایک قوم اور معاشرے کے لیے بُری ترین آفت تفرقہ ہے۔ قرآن مجید نے اپنی متعدد آیات میں اتحاد اور وحدت کی دعوت دیتے ہوئے اور اختلاف وانتشار کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے ضمناً اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ لڑائی جھگڑا، جدائی اور افتراق معاشرے کے زوال کا سبب ہے۔ اس بلا کی وجہ سے افراد اور امت کی توانائیاں رائیگاں چلی جاتی ہیں اور ان سے کوئی مثبت فائدہ حاصل نہیں ہوتا، قران فرماتا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ [31] ترجمہ: "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا۔ تمھارا حال یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اللہ نے

تمھارے دلوں میں محبت ڈال دی۔ پس تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے اور تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے۔ پس اس نے تمہیں بچالیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات کھول کھول کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔" مزید فرماتا ہے۔وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىۡ مُسۡتَقِيۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ‌ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ؕ ذٰ لِكُمۡ وَصّٰٮكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ترجمہ : " اور یہ میرا راستہ ہے اس کی پیروی کرو اور دوسرے مختلف راستوں پر مت چلو کیونکہ وہ تمہیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ وہ بات ہے جس کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔" ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ[32] ترجمہ : "اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں لڑائی اور جھگڑا نہ کرو تاکہ کمزور اور کم ہمت نہ ہو جاؤ اور تمہاری ہوا نہ اکھڑ جائے۔"

*****

حوالہ جات

1۔ تفسیر المیزان ج ۴ ص ۳۱

2۔آل عمران آیت ۱۳۷

3۔الفتح آیت ۲، ۲۳

4۔الاحزاب آیت ۶۲

5۔الاعراف آیت ۳۴

6۔الحجر آیت ۴، ۵

7۔بنی اسرائیل آیت ۵۸

8۔آل عمران آیت ۱۳۷، ۱۴۱

9۔الرعد آیت ۱۱

10۔الانفال آیت ۵۲، ۵۳

11۔بنی اسرائیل آیت ۷

12۔بنی اسرائیل ۸

13۔الروم آیت ۴۴
14۔ حٰم سجدہ آیت ۴۶
15۔الزمر آیت ۱۰
16۔الاعراف آیت ۹۶
17۔الجن آیت ۱۶
18۔البقرہ آیت ۱۳۴
19۔یونس آیت ۲۳
20۔الانعام آیت ۱۲۹
21۔الروم آیت ۴۱، ۴۲
22۔القمر: ۱۹۔
23 ۔العنکبوت آیت ۳۹-۴۰۔
24۔العنکبوت آیت ۴۱، ۴۳
25۔یونس آیت ۱۳
26۔انبیاء آیت ۱۱
27۔ قصص آیت ۵۹
28۔حج آیت ۴۵ ؛ ہود آیت ۱۱۷ ؛ کہف آیت ۵۹؛ اعراف آیت ۵۔۴
29۔اعراف آیت ۱۵۷
30۔حج آیت ۴۱
31۔آل عمران آیت ۱۰۳
32۔انفال آیت ۴۶

حدیث الغدیر از نظر محقق اسماعیل دیوبندی

Hadith of *AlGhadir* from the viewpoint of Deobandian Researcher '*Ismaeel*'

ابو اسد

مقدمہ

محقق دیوبند مولانا محمد اسماعیل دیوبندیؒ حدیث، کلام رجال اور علم مناظرہ کے وہ بے نظیر عالم دین تھے جن کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن ابھی تک ان کا خلاء پُر نہیں ہوا۔ اُنہوں نے قادیانیوں اور احمدیوں کے ساتھ علمی مناظرات کے ذریعے ختم نبوت کی حقانیت کو ثابت کیا اور مسلمانان پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے اس فرقہ ضالہ کو علمی شکست سے دوچار کیا۔ مولانا اسماعیلؒ کی تحقیقات ہمارا گراں قدر علمی سرمایہ ہیں۔ جس کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے محقق دوست جناب ابو اسد صاحب نے مولانا مرحومؒ کی تحقیقات سے ماخوذ یہ علمی مقالہ تیار کیا ہے۔ جس میں خالص علمی انداز میں سوال وجواب کی شکل میں حدیث غدیر کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ اس مقالے کو پیش کرنے کا واحد مقصد علمی و تحقیقی جذبہ ہے اور مختلف اسلامی مسائل کو علمی انداز میں پیش کرنا ہے۔ (ادارہ)

وجہ تسمیہ

سوال نمبر1: حدیث غدیر کی وجہ تسمیہ اور مقام غدیر خم کا محل وقوع کیا ہے؟

جواب: حدیث غدیر- من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ - حضرت رسول کریم ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام "غدیر خم" پر بیان فرمائی۔ اسی لیے اسے "حدیث غدیر" کہا جاتا ہے۔ مقام غدیر مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی کا تالاب تھا اور یہاں سے ایک راستہ یمن اور ایک راستہ شام، ایک راستہ واپس مکہ معظّمہ اور ایک راستہ سیدھا مدینہ کو جاتا تھا۔ گویا مقام غدیر چاروں اطراف سے ایک مرکزی جگہ پر تھا۔ مقام سے متعلق یہ تفصیل کتب احادیث وسیر اور کتب بلدان میں موجود ہے۔ حتی کہ صحیح مسلم جیسی مستند کتاب میں اس کا ذکر حضرت زید بن ارقم صحابی رسول کی زبانی ان الفاظ میں موجود ہے: عن زید

بن ارقم قال: قام رسول الله يوماً فينا خطيباً بمآء يدعى "خمّا" بين مكة و المدينة[1] یعنی: "زید ابن ارقم سے مروی ہے کہ انہوں کہا کہ: ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی کے ایک تالاب کے کنارے جسے "خم" کہا جاتا ہے، کھڑے ہو کر خطاب فرمایا۔"

اس حدیث کی شرح میں مشہور محدث علامہ ابو زکریا نواوی نے مقام غدیر کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کا محل وقوع بیان کیا ہے:"خماً" و بضم الخآء العجمة و تشديد الميم وهو اسم لغيضة على ثلاثة اميال من الجحفة غدير مشهور يضاف الى الغيضة فيقال: "غدير خم" یعنی: خم، خاء کے پیش اور میم کی شدّ کے ساتھ مقام جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر غدیر کے نام سے ایک مشہور تالاب تھا جسے "غدیر خم" کا نام دیا جاتا تھا۔" [2]

حدیث غدیر اور صحاح ستہ

سوال نمبر2: کیا ''حدیث غدیر'' کتب صحاح ستہ میں موجود ہے؟ نیز یہ کتنے صحابہ کرام سے روایت کی گئی ہے؟

جواب: ''حدیث غدیر'' ذخیرہ حدیث کے سب سے مستند مآخذ ''صحاح ستہ'' میں تقریبا چار صحابہ کرام سے روایت کی گئی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

1. جامع الترمذی الشریف، کتاب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالبؑ کی سب سے پہلی روایت حدیث نمبر ۳۷۱۲ جس کے راوی مشہور صحابی عمران بن حصین ہیں۔ یہ حدیث تفصیل سے ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: عن عمران بن حصين قال: قال رسول االله: انّ عليّا منى وانا منه وهو ولىّ كلّ مؤمن من بعدى۔[3]
2. اسی باب کی دوسری روایت جس کے راوی حضرت زید بن ارقم اور حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ یا حضرت حذیفہ بن اسید غفاری ہیں یوں ہے: عن زيد بن ارقم قال: قال رسول االله : من كنت مولاه فعلىّ مولاه۔[4]
3. اس کے علاوہ صحاح ستہ کی دوسری کتاب ''سنن ابن ماجۃ'' باب مناقب علیؑ میں مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کی گئی ہے:عن سعد قال: سمعت رسولّ االله يقول: من كنت مولاه فعلىّ مولاه۔[5]

4. اسی طرح ایک اور مقام پر یہ حدیث تفصیل سے موجود ہے: عن البرآء بن عازب قال: قال رسول االله فهذا ولیّ من انا مولاه اللّهمّ وال من والاه و عاد من عاداه۔[6]

حدیث غدیر کے راوی اور رجال

سوال نمبر3: کتب صحاح ستہ میں مذکورہ چاروں احادیث کی از روئے علم رجال و حدیث کیا حیثیت ہے؟

جواب: "صحاح ستہ" کی چاروں روایات صحیح ہیں جن کی تفصیل یہ ہے: حضرت عمران بن حصین کی روایت کہ جسے امام ترمذی نے مفصلاً ذکر کیا ہے وہ صحیح علی شرط مسلم ہے کیونکہ اس کی سند کے تمام راوی "صحیح مسلم" کے رواۃ میں سے ہیں۔ ملاحظہ ہو حدیث مذکورہ مع سند و متن:

قال الترمذی: حدثنا قتیبة بن سعید قال: حدثنا جعفر بن سلیمان الضبیعی، عن یزید المرشک، عن مطرف بن عبد االله، عن عمران بن حصین قال: بعث رسول االله جیشا واستعمل علیهم علیا فمضی فی السریة، وتعاقد اربعة من اصحاب رسول االله فقالوا: إذا لقینا رسول االله (ص) اخبرناه بما صنع علیٌ، وکان المسلمون إذا رجعوا من سفر بدوا برسول الله فسلّموا علیه، ثمّ انصرفوا إلی رحالهم فلمّا قدمت السریة فسلّموا علی النّبیّ، فقام احد الاربعة فقال: یا رسول االله الم تری انّ علی بن ابیطالبٌ صنع کذا وکذا؟ فاعرص عنه، ثمّ قام الثانی فقال مثل مقالته،فاعرض عنه، ثمّ قام إلیه الثالث فقال مثل مقالته فاعرض عنه، ثمّ قام الرابع، فقال مثل ما قالوا، فاقبل إلیه رسول االله والغضب یعرف فی وجهه فقال: ما تریدون من علیٌ، ما تریدون من علیٌ؟ إنّ علیا منّی وانا منه وهو ولیّ کل مؤمن من بعدی۔

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ سالتمآبؐ نے ایک جنگ کے موقع پر ایک لشکر کو تیار کیا اور اس پر علیؑ کا امیر لشکر بنایا تو چار عدد اشخاص نے حضرت علیؑ کے خلاف سازش کی کہ واپسی پر جب وہ رسالتمآبؐ سے ملاقات کریں گے تو حضرت علیؑ کی شکایت کریں گے لہٰذا سازش کے تحت باری باری ہر صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہؐ ۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ امیر لشکر علیؑ نے ایسا ایسا کیا؟ تو آپ نے پہلے تینوں سے منہ پھیر کر چوتھے کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہارا علیؑ کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں اور وہ میرے بعد تمام مومنین کے آقا و مولیٰ ہیں؟

حدیث غدیر کی اسناد

1 :اس حدیث کے پہلے راوی قتیبہ بن سعید بن جمیل ابو رجاء البغلانی ہیں وہ ثقہ، عادل، ضابط اور حافظ الحدیث ہیں۔ ۲۴۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان سے تمام اصحاب صحاح ستہ نے روایت کی ہے اور بقول حافظ ابن حجر مکی، امام بخاری نے ان سے تین سو آٹھ (۳۰۸) احادیث جبکہ امام مسلم نے چھے سو اڑسٹھ (٦٦٨) احادیث لی ہیں گویا وہ صرف صحیحین کی نو سو چھہتر (٩٧٦)احادیث کے راوی ہیں۔دیکھو ''تہذیب التھذیب'' جلد ۴ صفحہ ۵۲۱ راوی نمبر ٦۴٩٦۔

2 :امام مسلم نے اپنی ''صحیح'' میں جبکہ باقی ارباب صحاح ستہ نے اپنی کتب ''سنن اربعہ'' میں روایت کیا ہے، امام بخاری کے شیخ حافظ ابن المدینی نے اسے ثقہ قرار دیا ہے، جیسا کہ '' تہذیب التنذیب''(ا ۴۳۹) راوی نمبر ۱۱۰۷۔

3 :اس حدیث کے تیسرے راوی یزید الرشک کہ جن کا مکمل نام یزید بن ابی یزید ، کنیت ابو الازہر اور وہ بصرہ کے رہنے والے ہیں، اس سے سب اصحاب صحاح ستہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی، حافظ ابو حاتم اور ابن سعد نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔('' تہذیب التنذیب ''(٦-٢٢٨) راوی نمبر ۹۰۸۵)

4: اس حدیث کے چوتھے راوی عبد اللہ بن شجر ابو عبد اللہ البصری ہیں، یہ بھی پوری کتب صحاح ستہ کے رواۃ میں سے ہیں، مشہور محدث حافظ ابو الحسن العجلی نے اسے ثقہ صالح اور کبار تابعین میں سے قرار دیا ہے نیز بخاری شریف میں ان سے سات مقام پر روایت لی گئی ہے۔

5 : اس حدیث کے پانچویں اور آخری راوی مشہور صحابی حصرت عمران بن حصین ہیں ان سے بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر اصحاب سنن و مسانید نے احادیث بیان کی ہیں۔اس حدیث کی سند کے تمام راوی صحاح ستہ کے رواۃ میں سے ہیں، صرف ایک راوی جعفر بن سلیمان کہ جن سے امام بخاری کے علاوہ دیگر اصحاب صحاح ستہ نے روایت کیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس سند سے '' صحیح علی شرط مسلم'' ہے اسی لیے امام حاکم نیشاپوری نے اسے صحیح علی شرط مسلم جبکہ خود امام ترمذی نے اسے ''حدیث حسن'' قرار دیا ہے۔

ترمذی شریف کی دوسری روایت:

حدثنا مجمد بن بشار، حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبة، عن سلمة بن كهيل، قال: سمعت ابا طفيل، يحدّث عن ابی سريحة، او زيد بن ارقم شک شعبة عن النبی(ص) قال: من كنت مولاه فعلیّ مولاه۔[7]

ترمذی شریف کی یہ روایت مذکورہ سند کے ساتھ " صحیح علی شرط الشیخین" ہے۔ کیونکہ اس کے تمام راوی صحیح بخاری و مسلم کے رواۃ سے ہیں۔ سنن ابن ماجۃ کی پہلی روایت: حدثنا علی بن محمد، حدثنا ابو الحسن، اخبرنی حمّاد بن سلمة عن علی بن زید بن جدعان، عن عدی بن ثابت،عن البرآء بن عازب قال: اقبلنا مع رسول االله فی حجة التی حج فنزل فی بعض الطریق، فامر الصلاة جامعة، فاخذ بید علیؑ فقال: الست اولی بالمؤمنین من انفسهم؟ قالوا: بلیٰ، قال: ’فهذا ولیّ من انا مولاه،اللّهمّ وال من والاه و عاد من عاداه۔[8]

حضرت براء بن عازب کا بیان ہے کہ ہم رسالتمآبؐ کے ساتھ جب حجۃالوداع سے واپسی پر مقام (غدیر) پر پہنچے توآپ (ص) نے حکم دیا کہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائے گی، پھرآپ (ص) نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ کیا میں تمام مومنوں پر ان کی جان سے زیادہ اولی بالتصرف (حاکم) نہیں ہوں؟ سب صحابہ کرام نے ہاں میں جواب دیا۔ دوبارہ آپ (ص) نے پھر اس کا اقرار لیا۔ اس کے بعد آپ (ص) نے فرمایا کہ جس کا میں حاکم ہوں پس اس کے یہ علیؑ ولی وسرپرست ہیں۔ پھرآپ (ص) نے یہ دعا کی کہ اے اللہ۔ دوست رکھ اسے جو علیؑ سے دوستی و ولایت رکھے اور عداوت رکھ اس سے جو اسے دشمن رکھے۔اس حدیث کو مشہور محدیث و محقق علامہ ناصر الدین البانی نے " صحیح علی شرط مسلم "قرار دیا ہے۔

سنن ابن ماجہ کی دوسری حدیث

حدثنا علی بن محمد، حدثنا ابو معاویه، حدثنا موسیٰ بن مسلم، عن ابن سابط وهو عبد الرحمٰن، عن سعد بن ابی وقاص قال: قدم معاویة فی بعض حجّاته، فدخل علیه سعد، فذکروا علیاً فنال منه، فغضب سعد وقال: تقول هذا رجل سمعت رسول االله یقول: "من کنت مولاه فعلیّ مولاه" [9] ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ معاویہ نے حج کے پر سعادت موقع پر حسب عادت برادر رسول حضرت علیؑ کو سب وشتم کیا تو حضرت سعد نے معاویہ کے اس فعل پر ناراضگی کااظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اے معاویہ تو ایسی ہستی پر سب وشتم کرتا ہے کہ جس کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ :"جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؑ مولا ہیں۔"اس حدیث کو حافظ ابن کثیر نے" البدایۃ والنہایۃ" (۷-۲۳۹) میں حدیث حسن اور محقق البانی نے" سلسلۃالاحادیث الصحیحۃ" (۴-۳۳۶) میں

حدیث صحیح قرار دیا ہے۔ خلاصہ : "حدیث غدیر" حدیث کے سب سے مستند ماخذ کتب صحاح ستہ میں موجود ہے۔ بعض احادیث صحیح علی شرط شیخین ہیں اور بعض صحیح ہیں۔

حدیث غدیر اور صحیحین

سوال نمبر 4: کیا "حدیث غدیر" صحیحین (بخاری و مسلم شریف) میں روایت کی گئی ہے؟ اگر ایسا نہیں تو کیا اس سے " حدیث غدیر" کی صحت میں فرق پڑتا ہے؟

جواب: "حدیث غدیر" سے متعلق یہ سوال برادران اسلام کی طرف سے بعض حضرات نے اٹھایا ہے جبکہ اسی سوال کو بنیاد بنا کر ابن تیمیہ وغیرہ نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے کہ اگر " حدیث غدیر" صحیح ہوتی تو امام بخاری یا مسلم یا ان میں سے کوئی ایک ضرور اپنی " صحیح" میں درج کرتا چونکہ "صحیحین" میں روایت نہیں کی گئی لہٰذا اس کی صحت مشکوک ہے۔ برادران اسلام کی طرف سے ایسا سوال علم حدیث کی رو سے بھی درست نہیں نیز امام بخاری و مسلم کے نظریات بھی اس کے ساتھ نہیں دیتے، علم حدیث پر لکھی جانے والی تمام کتب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے اسے کہ "صحیحین" میں ہونا چاہیے۔ حالانکہ برادران اسلام ایسی دسیوں احادیث اپنے مذہب اہل السنّۃ کی بنیاد قرار دیتے ہیں جو احادیث بخاری و مسلم میں تو کجا صحاح ستہ کی دیگر کتب میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ حتی کہ صحاح ستہ کی دیگر کتب میں بھی صحیح اسانید سے روایت نہیں کی گئیں، مثلاً ایک حدیث کہ رسالتمآبؐ نے فرمایا: تركت فيكم شيئين كتاب اللهوسنّتی یعنی: " میں تمہارے درمیان قرآن و سنت چھوڑے جارہا ہوں۔" یہ حدیث صحاح ستہ کی متداول کتب میں کہیں بھی موجود نہیں، نیز یہ حدیث کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔

اس کے برخلاف دسیوں احادیث ایسی بھی ہیں کہ جو باوجود صحیح بخاری و مسلم میں ہونے کے پھر بھی ان کی صحت میں کلام ہے مثلاً "حدیث قرطاس" کہ جو صحت کے اعلیٰ معیار "صحیح متفق علیہ" حتی "اصح الاسانید" سے مروی ہونے کے باوجود بھی برادران اسلام کے ہاں غیر مقبول ہے۔ کیونکہ ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ "حدیث قرطاس" پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات کو ہم نے ایک علیحدہ رسالہ میں تحریر کر دیا ہے۔ اسی طرح " حدیث الکساء" کہ آیت تطہیر صرف پنجتن پاک علیہم السلام کے حق میں

اتری جو کہ بروایت حضرت عائشہ و حضرت ام سلمہ صحیح مسلم وجامع ترمذی سے ثابت ہے اور یہ دونوں کتب داخل صحاح ستہ ہیں۔

قول امام بخاری وامام مسلم در باب "صحیحین"

امام بخاری یا امام مسلم میں سے کسی ایک بزرگ نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انہوں نے اپنی کتب "صحیحین شریفین" میں تمام احادیث صحیحہ کو جمع کر دیا ہے، لہٰذا جو احادیث "صحیحین" میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں وہ ضعیف یا موضوع ہیں۔ حالانکہ خود امام بخاری و مسلم کا یہ قول علم حدیث کی اکثر کتب میں موجود ہے جیسا کہ اصول حدیث کی سب سے مستند ترین کتاب "مقدمہ ابن الصلاح" صفحہ نمبر ۲۴ پہلی نوع میں لکھا ہے: فقد روينا عن البخاری انه قال: "ما ادخلت فی کتاب الجامع إلّا ما صحّ و ترکت من الصّحاح لملال الطول "امام المحدثین محمد بن إسماعیل صاحب" بخاری شریف" نے اپنی کتاب کی نسبت کہا کہ میں نے اس کتاب میں صحیح احادیث کو جمع کیا ہے اور بہت سی صحیح احادیث کو طوالت کے خوف سے میں نے جان بوجھ کر اپنی صحیح میں درج نہیں کیا۔ اور یہی امام مسلم کا نظریہ ہے، جیسا کہ " مقدمہ مشکوٰۃ شریف" میں حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے لکھا ہے۔ نیز امام بخاری و مسلم کے یہ اقوال " فتح القریب " شرح التقریب صفحہ نمبر ۲۸ اور " تدریب الراوی" صفحہ ۸۹ کے علاوہ دیگر کتب علوم حدیث میں موجود ہیں۔

اسی مفہوم کو حافظ ابن کثیر دمشقی نے تحریر کیا ہے : ثم ان البخاری و مسلماً لم یلتزما بإخراج جمیع ما یحکم بصحته من الاحادیث، فإنّهما قد صحّحا احادیث لیست فی کتابیهما کما ینقل الترمذی وغیره عن البخاری تصحیح احادیث لیست عنده، بل فی السنن وغیرها.[10]

یعنی: " امام بخاری و مسلم نے اپنی شرائط کے مطابق تمام احادیث صحیحہ کو بالاستیعاب اپنی کتب صحیحین میں جمع نہیں کیا حالانکہ انہوں نے بہت سی احادیث کو صحیح قرار دیا۔ اگرچہ وہ احادیث بخاری و مسلم میں نہیں جیسا کہ امام ترمذی وغیرہ نے بخاری کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے بہت سی احادیث کی تصحیح کی ہے حالانکہ وہ " صحیح بخاری " میں نہیں بلکہ ان کی تصحیح شدہ احادیث کتب سنن وغیرہ (مسانید ومعاجم و مستدرکات) میں موجود ہیں۔"

ان قواعد وحقائق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ " حدیث غدیر" چونکہ " صحیح بخاری ومسلم" میں نہیں ہے؛ لہٰذا قابل حجت نہیں، یہ قول سوائے ہذیان کے اور کچھ نہیں جبکہ "حدیث غدیر" کا صحیح بخاری یا صحیح مسلم میں نہ ہونے سے اس کی صحت کے لیے مضر نہیں۔

حدیث غدیر بر اساس شرائط صحیحین

سوال نمبر5: " حدیث غدیر" اگر " صحیحین" میں نہیں ہے تو کیا اس کی کچھ اسانید بخاری ومسلم یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی شرائط پر صحیح ہیں؟

جواب: محدثین اہل السنّۃ کے ہاں صحیحین یا شیخین کی شرط سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث اگرچہ ان دونوں یا کسی ایک میں مذکور نہیں لیکن وہ حدیث دیگر کتب احادیث میں ان رواۃ سے بیان کی گئی ہو جن سے امام بخاری ومسلم ہر دو نے اپنی کتب میں روایت کیا ہو۔امام بخاری ومسلم کی مذکورہ شرط کے تحت " حدیث غدیر" کی دسیوں روایات صحیح ہیں اور ذخیرہ احادیث کی کتب جوامع، مسانید، سنن، معاجم اور مستدرکات وغیرہ میں موجود ہیں۔ یہاں بطور مثال چند احادیث بیان کرتے ہیں کہ جو بخاری ومسلم کی شرائط پر صحیح ہیں، جیسے " جامع الترمذی" صفحہ ۹۷۸ حدیث نمبر ۳۷۲۲ باب مناقب الإمام علی بن ابی طالبؑ۔" حدیث غدیر" کی چند مثالیں جو بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح ہیں:

پہلی مثال:

قال الترمذی: حدّثنا محمد بن بشار، حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبة، عن سلمه بن کهیل، قال: سمعت ابا الطّفیل یحدّث عن ابی سریحة او زید بن ارقم شک شعبة عن النبیّ قال:من کنت مولاه فعلیّ مولاه.

یہ حدیث مذکورہ سند کے ساتھ صحیح علی شرط صحیحین ہے کیوں کہ اس کے تمام راوی صحیح بخاری ومسلم کے راوی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔ محمد بن بشار بن عثمان بن داؤد ہیں جن کی کنیت ابو بکر العبدی اور بصرہ کے رہنے والے اور بندار کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۶۷ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ امام نسائی، دار قطنی اور ابو حاتم وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ امام بخاری نے ان سے اپنی "صحیح" میں ۲۰۵ اور امام مسلم نے ۴۶۰ احادیث درج کی ہیں گویا صحیحین کی ۶۶۵ احادیث کے راوی ہیں بقیہ سنن اربعہ کے بھی راوی ہیں۔ اس حدیث کے دوسرے راوی محمد بن جعفر ابو عبد اللہ الہذلی

ہیں جو " غندر" کے لقب سے مشہور ہیں۔ حافظ ابو حاتم ابن سعد اور ابو الحسن العجلی نے ان کو ثقہ کہا ہے اور امام بخاری نے ان سے کم از کم ۱۵۰ احادیث روایت کی ہیں۔اس کے علاوہ امام مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت لی ہیں جیسا کہ "تہذیب التہذیب" جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۵۹ میں مذکور ہے۔اس حدیث کے تیسرے راوی شعبۃ بن الحجاج جن کی کنیت ابو البسطام الازدی ہے علم جرح و تعدیل کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ان سے تمام اصحاب صحاح ستہ نے احادیث بیان کی ہے۔ ایک محتاط اندازے کی مطابق صرف صحیح بخاری میں ۱۶۰۰ احادیث روایت کی گئی ہیں۔"تہذیب التہذیب" جلد ۲، صفحہ نمبر ۴۹۴ میں ان کے حالات مذکور ہیں۔

اس حدیث کے چوتھے راوی سلمۃ بن کہیل بن حصین ابو یحیٰ کوفی ہیں ۔۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳ھ میں وفات پائی۔ ابو حاتم، امام نسائی اور حافظ عجلی وغیرہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔صرف بخاری شریف میں ان سے ۱۷ احادیث روایت کی گئی ہیں اور صحیح مسلم کے بھی راوی ہیں۔ 'تہذیب التہذیب" (۳۸۲۳) اس حدیث کے پانچویں راوی حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ، مشہور صحابی ہیں۔آپ نے تقریباً سب صحابہ کرام سے آخر میں وفات پائی، اسی طرح حضرت ابو سریحۃ جن کا اصل نام حضرت حذیفہ بن اسید الغفاری ہے جبکہ حضرت زید بن ارقم بھی مشہور صحابی ہیں۔ حضرت ابو الطفیل اور زید بن ارقم صحیحین اور حضرت ابو حذیفہ صرف صحیح مسلم کے رجال میں سے ہیں۔

دوسری مثال:

حدثنا محمد بن المثنّى، قال: حدثنا ابو احمد، قال: حدثنا عبد الملک بن ابی غنية، عن الحكم، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس قال: حدثنی بريدة قال: قال رسولّ الله: من كنت مولاه فعلیّ مولاه.[11]

اس حدیث کے پہلے راوی محمّد بن المثنیٰ جن کی کنیت ابو موسیٰ ہے، ان سے تمام اصحاب صحاح ستہ نے روایات لی ہیں۔ صرف "بخاری شریف" میں ان سے کم از کم ایک سو (۱۰۰) احادیث روایت کی گئی ہیں۔اس حدیث کے دوسرے راوی ابو احمد جن کا نام محمد بن عبد اللہ بن زبیر الزبیری ہے، اور کنیت ابو احمد ہے ان سے "بخاری شریف" میں بیس (۲۰) احادیث لی گئی ہیں۔ نیز پوری صحاح ستہ میں ان کی روایات موجود ہیں۔اس حدیث کے تیسرے راوی عبد الملک بن حمید ابی غنی ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم کے

رواۃ میں سے ہیں، بخاری شریف حدیث نمبر ۱۰۱۷ کے راوی ہیں۔اس حدیث کے چوتھے راوی الحکم بن عتیبۃ ہیں۔ کنیت ابو محمد ہے۔ صرف بخاری شریف میں ان سے کم از کم پچاس احادیث مروی ہیں۔

تیسری مثال

قال احمد: حدثنا وکیع، حدثنا الاعمش، عن سعد بن عبیده عن ابن بریده قال: قال رسول االله: من کنت ولیّه فعلیّ ولیّه[12]

اس حدیث کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری و مسلم کے رجال میں سے ہیں، اختصار کے مدّ نظر اس موضوع کی دیگر احادیث کو ہم نے اپنی دوسری کتاب "اسانید حدیث غدیر" میں جمع کر دیا ہے جو " صحیح علی شرط الشیخین" ہیں۔

حدیث غدیر اور ائمہ جرح و تعدیل

سوال نمبر6: کیا ائمہ جرح و تعدیل اور حفاظ حدیث میں سے کسی مستند عالم نے " حدیث غدیر" کی توثیق کی ہے؟

جواب: برادران اسلام کے مستند حفاظ حدیث اور ماہرین علم رجال و حدیث نے " حدیث غدیر" کو " صحیح " قرار دیا ہے، اگرچہ ان علماء کی تعداد بیسیوں سے متجاوز ہے لیکن بطور اختصار چند محدّثین کہ جن کے علم و فضل اور فن حدیث میں تبحر کا انکار ناممکن ہے۔ نیز انہی بزرگوں کی تحقیقات کے سہارے اس علم حدیث میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے پہلے حافظ ابو عبد اللہ ذہبی ہیں کہ جنہوں نے "حدیث غدیر" کو صرف " صحیح " ہی نہیں بلکہ " حدیث متواتر" قرار دیا ہے۔ دوسرے حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں کہ جنہوں نے بخاری شریف کی سب سے مستند ترین شرح " فتح الباری" لکھی۔ وہ اسی شرح کے جلد نمبر ۷ صفحہ نمبر ۹۳ باب مناقب علی بن ابی طالبؑ میں "حدیث غدیر" کی تحسین و تصحیح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

وامّا حدیث {من کنت مولاه فعليّ مولاه} فقد اخرجه الترمذی والنسائی وهو کثیر الطرق جدّاً، وقد استوعبها ابن عقدة فی کتاب فرد، وکثیر من اسانیدها صحاح و حسان.[13]

یعنی: "حدیث غدیر" کو امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث بہت زیادہ اسانید سے روایت کی گئی ہے اور مشہور حافظ حدیث علامہ ابن عقدہ نے اس حدیث پر ایک مستقل کتاب

لکھی ہے جس میں "حدیث غدیر" کے تمام متون و اسانید کو جمع کر دیا اور میرے نزدیک اس کی اکثر اسانید صحیح اور حسن درجہ کی ہیں۔"

حافظ ابو بکر الہیثمی نے اپنی کتاب " مجمع الزّوائد" جلد ۹ صفحہ ۱۰۳تا۱۰۹تک اس کی دسیوں احادیث کو صحیح، حسن اور جید قرار دیا ہے۔ مشہور محدّث علامہ المحاملی نے " حدیث غدیر" کو صحیح قرار دیا ہے، جیسا کہ علّامہ جلال الدّین السیوطی نے " الجامع الکبیر" (۱۶-۲۵۵) حدیث نمبر ۸۶۳۷ پر اس قول کو ذکر کیا ہے۔ نیز خود علامہ جلال الدّین سیوطی نے اپنی کتاب " الجامع الکبیر" (۶-۲۱۱) حدیث نمبر ۴۴۰۰ کے علاوہ متعدد مقام پر اس کی صحت کا اقرار کیا ہے۔ علامہ برہان الدّین الحلبی الشافعی نے کہ جنہوں نے سیرۃ النّبی (ص) پر ایک مستند کتاب لکھی ہے، اسی کتاب میں " حدیث غدیر" کی توثیق و تصحیح کا ذکر کیا ہے کہ:

هذا حديث صحيح ورد باسانيد صحاح و حسان ولا التفات لمن قدح فی صحته[14] یعنی: حدیث غدیر کی صحت مسلّم ہے اور یہ باسانید صحیحہ و حسنہ روایت کی گئی ہے اور جس نے اس کی صحت میں کلام کیا اس کے قول کی طرف توجہ نہ کی جائے۔

آپ مزید لکھتے ہیں: فقد ورد ذلک من طرق صحّح الذهبی کثیراً منها یعنی: اس کی اکثر اسانید کو مشہور ماہر علم رجال وحدیث حافظ ابو عبد اللہ ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ: والحدیث ثابت بلا ریب[15] کہ حدیث غدیر کی صحت ثابت ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

اسی طرح حافظ ابن کثیر دمشقی نے اپنی کتاب " البدایۃ والنہایۃ" جلد ۵ صفحہ ۱۵۰تا ۱۵۴ میں اس حدیث کی اکثر اسانید کو صحیح قرار دیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی جنہوں نے اپنی کتاب " تفسیر المظہری" جلد ۳ صفحہ ۱۳۴ پر اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ ملّا علی القاری مشہور حنفی محدث نے مشکوٰۃ المصابیح کی شرح "مرقاۃ المفاتیح" جلد ۱۱ صفحہ ۳۴۲ میں اسے حدیث صحیح قرار دیا ہے۔ اور دور حاضر کے مشہور محقق اور ناقد حدیث علامہ ناصر الدین البانی نے اس حدیث کو اپنی کتب "سلسلۃ الاء حادیث الصحیحۃ" جلد ۳ صفحہ ۳۳۱ میں متعدد مقام پر اس حدیث کو صحیح بلکہ متواتر اور ابن تیمیہ کی جرح کو دلائل سے رد کیا ہے۔

حدیث غدیر اور ائمہ جرح و تعدیل

سوال نمبر 7: کیا محدّثین و حفاظ حدیث میں سے کسی نے " حدیث غدیر" کو متواتر شمار کیا ہے؟

جواب: امام اہل السنۃ حضرت امام احمد بن حنبل نے " حدیث غدیر" کو حدیث حسن اور امام ترمذی نے "حدیث حسن صحیح " قرار دیا ہے۔امام احمد کی تحسین کو ابن تیمیہ نے اپنی کتاب" منہاج السنۃ" (۳ ۸۶) پر ذکر کیا ہے۔ جبکہ امام ترمذی کی تحسین و تصحیح جامع الترمذی کے بعض نسخوں میں موجود ہے۔البتہ بعض مطبوعہ نسخوں میں " صحیح" کی لفظ اڑا کر صرف حدیث حسن لکھا گیا ہے جو کہ خلاف قواعد ہے جبکہ سند حدیث کے تمام راوی " صحیح علی شرط الشیخین" کی صفت کے حامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے تو صرف حدیث حسن کہنا تحریف حدیث کی بدترین مثال ہے۔ امام ترمذی جیسے متبحر اور عالم بالحدیث سے اس کا صدور ناممکن ہے۔البتہ یہ امر بعد والے ناشران کی ہاتھ کی صفائی کا مظہر ضرور ہے۔

اب ہم چند محدثین اعلام کا ذکر کرتے ہیں کہ جنہوں نے " حدیث غدیر" کو متواتر قرار دیا ہے۔ان میں سب سے پہلے مشہور مورخ و محدث و ناقد اور ماہر علم رجال وحدیث حافظ ابو عبد اللہ الذہبی ہیں کہ جن کی مؤلفہ کتب رجال حدیث کے سہارے راویان حدیث کو پرکھا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "تاریخ الاسلام" میں حضرت امام محمد ابن ادریس الشافعی کے حالات میں تحریر کرتے ہیں:

ومعنى هذا التشيع حبّ على عليه السلام وبغض النّواصب و ان يتخذه مولاً بما تواتر عن نبينا: من كنت مولاه فعليّ مولاه[16] کہ تشیع سے مراد حبّ علیؑ اور بغض نواصب ہے اور حضرت علیؑ کی ولایت کا اقرار کرنا جیسا کہ پیغمبر اسلام (ص) سے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ " جس کا میں مولی ہوں اس کے علیؑ مولا ہیں"۔یہی حافظ ابو عبد اللہ ذہبی اپنی دوسری کتاب " سیر اعلام النبلاء" میں مطلب بن زیاد کے حالات میں لکھتے ہیں: عن جابر بن عبد االله فقال: كنّا بالجحفة بغدير خم فخرج علينا رسول الله من خباء او فسطاط فاشار بيده ثلاثا، فاخذ بيد على فقال: من كنت مولاه فعليّ مولاه، هذا حديث حسن عال جدّاً و متنه فمتواتر.[17] کہ اس حدیث غدیر سند کے لحاظ سے نہایت ہی اعلی درجہ پر ہے اور متن حدیث غدیر متواتر ہے۔

حافظ ذہبی کے اور ابن تیمیہ کے ہم عصر مشہور مؤرخ و محدّث و مفسر حافظ ابن کثیر دمشقی اپنی کتاب "البدایۃ النہایۃ" میں حدیث غدیر کو متعدد طرق سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: وصدر الحديث متواتر اتيقن ان رسول الله قاله واما: "اللهم وال من والاه وعاد من عاداه" فزياة قوية الاسناد[18] کہ حدیث غدیر کا پہلا حصہ " من كنت مولاه فعليّ" متواتر ہے، اور میں پورے یقین سے کہتا

ہوں کہ واقعی پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کے حق میں ایسا فرمایا ہے۔ البتہ دوسرا حصہ: اللهم وال من والاه وعاد من عاداه کی اسناد بھی قوی درجہ کی ہیں۔

فن تاریخ و تفسیر کے امام مشہور محدث و مفسر و فقیہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے بھی "حدیث غدیر" کو متواتر شمار کیا ہے اور انہوں نے اس موضوع پر مستقل ایک کتاب بنام "کتاب الموالاۃ" یا "کتاب الولایۃ" لکھی جس میں انہوں نے "حدیث غدیر" کو کم از کم پچھتّر (۷۵) صحابہ کرام سے روایت کیا ہے، جیسا کہ علم حدیث کی مستند کتاب "اسبال المطر" صفحہ ۲۷ پر حدیث متواتر کی بحث میں موجود ہے: وذكر محمدبن جرير حديث غدير خم وطرقه من خمسة و سبعين طرقا، و افرد له كتابً سمّاه "كتاب الولاية"

حافظ ذہبی نے ابن جریر طبری کی "کتاب الولایۃ" کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے: تذكرة الحفاظ" (۲۰۳۲)ترجمه الطبرى"رايت مجلداً من طرق الحديث (حديث الغدير) لإبن جرير فاندهشت له ولكثرة تلك الطرق یعنی: "امام ابن جریر طبری کی حدیث غدیر کے باری میں "کتاب الولایۃ" کو میں نے دیکھا کہ جس میں انہوں نے حدیث غدیر کے اسانید کو جمع کیا ہے تو میں حدیث غدیر کی کثرۃ طرق کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔"

"حدیث غدیر" کو مشہور مورخ و مفسر اور محدث و فقیہ حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی متواتر قرار دیا ہے اور انہوں نے اپنی کتاب "قطف الازهار المتناثرة" کہ جس میں انہوں نے صرف احادیث متواتر کو جمع کیا ہے، اسی کتاب کے صفحہ ۱۷۷ ح ۱۰۲ پر حدیث غدیر کو بھی درج کیا ہے اور امام سیوطی نے اپنی دوسری کتاب "الجامع الکبیر" کے متعدد مقام پر اسے حدیث صحیح اور متواتر کہا نیز ان کے تواتر کے حکم کو مشہور محدث علامہ عبد الرؤف مناوی نے "فیض القدیر" (۶ ۲۸۲) حدیث نمبر ۹۰۰۰ کی شرح میں ذکر کیا ہے: وقال السيوطى" حديث متواتر"۔

اسی طرح محدّث ملا علی القاری الحنفی نے مشکوٰۃ شریف کی شرح "مرقاۃ المفاتیح" میں حدیث غدیر کو متواتر تسلیم کیا ہے: و الحاصل ان هذا الحديث صحيح، لا مرية فيه، بل بعض الحفاظ عده متواتراً، إذ فى رواية لاحمد انه سمعه من النّبى ثلاثون صحابياً، وشهدوا به لعلىٍّ لمّا نوزع ايام خلافته.[19] یعنی: "حدیث غدیر کی صحت کے متعلق تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث کی صحت

ثابت ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں، بلکہ حافظان حدیث نے اسے حدیث متواتر شمار کیا ہے اور امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق تیس (۳۰) صحابہ کرام نے اسے خود پیغمبر اسلامؐ سے روایت کیا، جیسا کہ مسند احمد میں یہ روایت موجود ہے اور ان تیس صحابہ کرام نے مقام رحبہ پر حضرت علیؑ کے زمانے میں آپ کے استفسار پر گواہی دی کہ واقعی حضور اکرمؐ نے یہ حدیث ان کے حق میں بیان فرمائی ہے۔"

خاتم المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کہ جن کے سہارے سے مذہب اہل السنۃ ہندوستان میں متعارف ہوا، انہوں نے اپنی کتاب "إزالة الخفاء" میں حدیث غدیر کو متواتر تسلیم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ومن المتواتر حديث الغدير: اللهم وال من والاه وعاد من عاداه.[20] اسی طرح عصر حاضر کے مشہور محدث و محقق علامہ ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب "سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ" کے متعدد مقام پر "حدیث غدیر" کو متواتر قرار دیا ہے۔ چنانچہ (۳۴۴۴) م ۷۵۰ کے تحت حدیث غدیر کی بعض اسانید کو صحیح علی شرط الشیخین اور بعض کو صحیح علی شرط مسلم قرار دینے کے بعد یہ تحریر کرتے ہیں: وجملة القول ان حديث الغدير صحيح بشرطيه، بل الاوّل منه متواتر عنه كما يظهر لمن تتبع اسانيده وطرقه.

حدیث غدیر کا تواتر

خلاصہ یہ کہ حدیث غدیر اپنے دونوں جملوں "من كنت مولاه، فعلي مولاه" اور "اللهم وال من والاه وعاد من عاداه" کے ساتھ صحیح اور ثابت ہے۔ بلکہ حدیث کا پہلا حصہ متواتر ہے۔ جیسا کہ احادیث کی تحقیق و جستجو کرنے والے کے لیے یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے۔ جیسا کہ مشہور محمد بن اسماعیل الامیر الیمانی کہ جن کی وفات (۱۱۸۲ھ) میں ہوئی نے اصول حدیث کی مشہور کتاب "اسبال المطر" میں حدیث متواتر کے احکام و مسائل و شرائط کو بیان کرتے ہوئے حدیث متواتر کی امثلہ میں سے حدیث غدیر کو بھی بطور مثال پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: حديث غدير خم رواه جماعة من الصحابة وتواتر النقل به حتى دخل حدّ التواتر، وذكر محمد بن جرير حديث غدير خم و طرقه من خمسة وسبعين طريقاً و افرد له كتاباً سماه "كتاب الولاية" وصنف الذهبي جزئاً في طريقه وحكم بتواتره وذكر ابو العباس بن عقدة حديث غدير خم من ماته وخمسين طريقاً۔[21]

یعنی: "حدیث غدیر کو صحابہ کرام کی ایک بہت بڑی جماعت نے روایت کیا ہے اور ہر زمانہ میں تواتر سے نقل ہوتی آ رہی ہے یہاں تک کہ حد تواتر کو پہنچ گئی ہے اور امام ابن جریر طبری نے حدیث غدیر کو کم از کم

پچھتّر (۷۵) سندوں سے روایت کیا ہے اور اس موضوع پر ''کتاب الولایۃ'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔اور حافظ ابو عبد اللہ ذہبی نے بھی حدیث غدیر کی اسانید پر ایک رسالہ تحریر کیا ہے، اور انہوں نے بھی اس پر حدیث متواتر کا حکم لگایا ہے اور ابوالعباس ابن عقدۃ نے اس موضوع پر ایک علیحدہ کتاب لکھی ہے جس میں اس کی ایک سو پچاس اسناد کو جمع کیا ہے۔"

مشہور محدث حافظ العجلونی اسماعیل بن محمد الشافعی صاحب فیض الجارح شرح صحیح البخاری ۱۱۶۲ھ نے اپنی کتاب '' کشف الخفاء'' میں حدیث غدیر کے تواتر کا اقرار ان لفظوں میں کیا ہے: "من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ" رواہ الطبرانی واحمد والصباء فی "المختارۃ" عن زید بن ارقم و علیؑ وثلاثین من صحابۃ: "اللّھم وال من والاہ وعاد من عاداہ"؛ فالحدیث متواتر او مشھور.[22]

مشہور مفسر حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ العثمانی نے جنہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہے، اپنی کتاب '' تفسیر المظہری'' (۱۳۴۴) میں آیت ولایت: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ کی تفسیر میں حدیث غدیر پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے:وقد بلغ ھذا الحدیث مبلغ التواتر رواہ جمع من المحدّثین فی الصّاح والسنن والمسانید بروایۃ نحو من ثلاثین من اصحاب رسول االلہ منھم علی بن ابی طالبؑ وبریدۃ بن حصیب وابو ایّوب وعمرو بن مرۃ و ابوھریرۃ وابن عباس وعمار بن یاسر وسعد بن ابی وقاص وابن عمر وانس وجریر ومالک بن الحویرث وابو سعید الخدری وطلحۃ وابو الطفیل وحذیفۃ بن اسید وغیرھم۔

یعنی: " حدیث غدیر حدّ تواتر تک پہنچ چکی ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے کتب صحاح، کتب سنن اور کتب مسانید میں اسے تقریبا تیس صحابہ کرام سے روایت کیا ہے جن میں علی بن ابی طالبؑ وبریدۃ بن حصیب وابو ایّوب وعمرو بن مرۃ وابوھریرۃ وابن عباس وعمار بن یاسر وسعد بن ابی وقاص وابن عمر وانس وجریر ومالک بن الحویرث وابو سعید الخدری وطلحۃ وابو الطفیل وحذیفۃ بن اسید وغیرہ شامل ہیں۔"

اس کے بعد صاحب کتاب نے سولہ (۱۶) صحابہ کرام کے اسماء کا ذکر کیا ہے اور ان کے علاوہ بکثرت صحابہ نے اسے روایت کیا ہے۔ دور حاضر کے محقق اور محدث الدکتور حسین سلیم اسد کہ جنہوں نے مسند ابی یعلیٰ، اور صحیح ابن حبان کے علاوہ بہت سی کتب پر عمدہ تحقیقات وتعلیقات لکھی ہیں وہ '' صحیح ابن حبان'' پر تحقیق و

تعلیق میں ''حدیث غدیر'' کے تواتر کو یوں بیان کرتے ہیں: حديث الغدير"من كنت مولاه فعليّ مولاه" صحيح وانظر ''نظم المتناثرة فی الحديث المتواترة، ص ۱۳۴ حيث ذكر ازور وعن خمسة وعشرين صحابيا۔[23]

حدیث غدیر کے تواتر کے قائلین کا مقام و مرتبہ

سوال نمبر8: جن محدثین وائمہ جرح وتعدیل اور ماہرین علم رجال وحدیث نے ''حدیث غدیر'' کو صحیح، حسن یا متواتر کہا ہے ان کا اہل السنۃ کے ہاں کیا مقام ہے؟

جواب: جن علماء و محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے حدیث غدیر کو صحیح اور متواتر تسلیم کیا ہے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے وقت کا نہایت ہی مستند عالم اور جملہ علوم اسلامیہ (حدیث، تفسیر، تاریخ، رجال، لغت، فقہ و کلام) کا صرف ماہر ہی نہیں بلکہ ان تمام علوم وفنون میں مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ان بزرگوں کی تحقیقات کو رد کر دیا جائے تو پھر تمام ذخیرہ حدیث مشکوک ہو جائے گا۔ اب ہم ان محدثین و محققین اور ماہرین علم رجال وحدیث کے کوائف ذکر کرتے ہیں کہ جنہوں نے 'حدیث غدیر'' کی توثیق فرمائی۔ نیز یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ ان تمام محدثین کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ لیکن بطور اختصار ہم صرف ان کا ذکر کریں گے جن کی توثیقات کو ہم نے گذشتہ بحث میں ذکر کیا ہے:

1. امام اہل السنۃ حضرت امام احمد بن حنبل

امام اہل السنۃ حضرت امام احمد بن حنبل نے ''حدیث غدیر'' کو'' حدیث حسن'' قرار دیا ہے، اور انہوں نے اپنی کتاب'' المسند'' اور کتاب ''فضائل الصحابۃ'' میں دسیوں مقامات پر حدیث غدیر کو متعدد صحابہ کرام سے روایت کیا ہے اور امام احمد کی تحسین حدیث غدیر کو ابن تیمیہ جیسے متعصب نے بھی اپنی کتاب'' منہاج السنۃ ''(۸۶۴) ص'' پر ذکر کیا ہے۔ آپ کا پورا نام احمد بن حنبل بن ہلال اور کنیت ابو عبد اللہ الشیبانی البغدادی ہے۔ آپ کی ولادت (۱۶۴ھ) میں ہوئی ہے اور وفات (۲۴۱ھ) میں ہوئی۔ آپ فقہ وحدیث میں مستقل امام شمار کئے جاتے ہیں اور آپ فقہائے اربعہ یا ائمہ میں سے ایک ہیں۔ آپ کی وجہ سے اہل السنۃ کا یہ فرقہ حنبلی المسلک کہلاتا ہے۔

آپ نے طلب حدیث کے لیے کوفہ، بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا سفر کیا۔ امام بخاری و مسلم بن حجاج جو کہ ذخیرہء حدیث کی سب سے مستند کتب بخاری شریف و مسلم شریف (صحیحین) کے مؤلفین

ہیں، آپ ہی کے صحبت یافتہ اور شاگرد ہیں۔ آپ کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں ۔ آپ کو تمام محدثین نے ثقہ حجت قرار دیا ہے نیز آپ امام شافعی کے شاگردوں میں سے ہیں۔آپ اہل بیت رسالتؐ کے بارے میں کسی حد تک نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اسی لیے جب آپ سے آپ کے بیٹے عبد اللہ نے اہل بیتؑ اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:"امّا اهل البيت، فلا يقاس بهم احد" یعنی: "جہاں تک اہل بیت کا تعلق ہے تو اُن کے ساتھ کسی کا مقائسہ نہیں کیا جا سکتا۔"

فضائل امام علی ابن ابی طالبؑ سے متعلق آپ کا یہ فرمان کتب تاریخ وسیر میں موجود ہے کہ: ماجاء لاحد من الفضايل باسانيد الصحيحة ما جاء لعليؑ ترجمہ: " تمام ذخیرہ حدیث میں جس قدر صحیح احادیث علیؑ کی فضیلت میں موجود ہیں، کسی ایک بھی صحابی کے حق اس قدر احادیث نہیں ملتیں۔"حافظ ابن جوزی نے کتاب "فضائل الامام احمد" صفحہ نمبر ۱۶۲ پر ان دونوں اقوال کو ذکر کیا ہے۔ امام احمد کا دوسرا قول " فتح الباری" (۷۶۷) باب فضائل علی اور " الاصابۃ" اور "تہذیب التہذیب" میں موجود ہے۔ نیز آپ نے اہل بیت رسالت سے مروی اسناد کو " سلسلۃ الذہب" قرار دیا اور کہا۔ "جس سند میں امام جعفر صادقؑ، امام محمد باقرؑ، امام زین العابدینؑ، امام حسینؑ اور امام علیؑ ذکر ہوں تو وہ سب سے زیادہ صحیح سند ہے۔" مزید یہ بھی فرمایا:لو قرا هذا الاسناد علىٰ مجنون لافاق یعنی: " اگر اہل بیت کی سند کے سلسلۃ الذہب کو کسی مجنون پر پڑھا جائے تو اسے شفاء مل جائے گی۔"

2. محمد بن عیسیٰ

دوسرے محدث جنہوں نے " حدیث غدیر" کی توثیق کی ہے، وہ کتب صحاح ستہ میں سے " جامع الترمذی" کے مؤلف ہیں جن کا نام محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ابو عیسیٰ ہے۔ آپ "امام ترمذی" کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور (۲۷۹ھ) میں وفات پائی۔ آپ کو امام بخاری کا شرف تلمذ بھی حاصل ہے۔ آپ کا شمار ان محدثین و حفاظ حدیث میں ہوتا ہے کہ جن کی علم حدیث و رجال میں اقتدا کی جاتی ہے۔ آپ نے "کتاب الجامع" کے علاوہ " علل الحدیث" اور تاریخ پر کتب تالیف کی ہیں۔ آپ کی تالیفات کے متعلق ابو سعد ادریسی یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسے آدمی کی تالیفات ہیں کہ جو صاحب علم و تقویٰ تھے اور ان کے حفظ کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کی نسبت امام بخاری نے یہ کہا۔ "امام ترمذی نے باوجود میرا شاگرد ہونے کے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جتنا باوجود استاد ہونے کے میں نے ان سے اٹھایا ہے"۔

امام ترمذی اپنی کتاب "جامع الترمذی" کے صحت کے بارے میں یہ کہتے ہیں۔" جب میں نے یہ کتاب تالیف کی اوراسے محدثین حجاز وعراق اور علماء خراسان کے سامنے پیش کیا تو سب میری اس تالیف سے خوش ہوئے اور اس کو پسند کیا"۔ نیز امام ترمذی کا خود اپنا قول تو ہر عام وخاص کو معلوم ہے کہ: من کان فی بیته هذا الکتاب فکانّما نبیّ یتکلّم فی بیته یعنی: " جس گھر میں یہ میری کتاب " جامع ترمذی" موجود ہے گویا اس کے گھر میں خود پیغمبر اسلامؐ کلام فرمارہے ہیں ۔"

البتہ اس کا بات کا بیان بھی یہاں ضروری ہے کہ بعض محدثین نے امام ترمذی کے بارے میں یہ کہا کہ وہ کسی حدیث کی تحسین و تصحیح کے بارے میں متساہل ہیں اور سند حدیث میں کسی راوی کے ضعیف ہونے کے باوجود اس کی توثیق کر دیتے ہیں البتہ جامع الترمذی میں " حدیث غدیر" کی توثیق سے متعلق ایسے تساہل کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ "حدیث غدیر" کو امام ترمذی نے ان راویوں سے روایت کیا ہے جن سے امام بخاری و مسلم ہر دو نے اپنی صحیحین میں روایات درج کی ہیں جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے۔

3. حافظ محمد بن جریر الطبری

تیسرے محدث جنہوں نے "حدیث غدیر" کو صرف صحیح ہی نہیں بلکہ "حدیث متواتر" تسلیم کیا ہے، وہ مشہور محدث و مؤرخ ومفسر و فقیہ حافظ محمد بن جریر الطبری ہیں۔ آپ کی ولادت (۲۲۴ھ)اور وفات (۳۱۰ھ) میں ہوئی۔ آپ کی نسبت ابن تیمیہ نے یہ کہا۔"ابن جریر طبری صرف ثقہ عادل ہی نہیں بلکہ ان کی تفسیر جامع البیان امہات تفاسیر میں شمار ہوتی ہے اور سب سے صحیح ترین تفسیر قرآن ہے۔" نیز حافظ ابوبکر خطیب بغدادی نے ابن جریر طبری کے احوال میں یہ لکھا ہے:

کان احد الائمة یحکم بقوله ویرجع الی رایه لمعرفته وفضله،جمع من العلوم ما لم یشارکه فیه احد من اهل عصره، فکان حافظا لکتاب الله، بصیراً لمعانیه فقیهاً فی احکام القرآن عالماً بالسنن وطرقها وسقیمها، وناسخها ومنسوخها، عارفاً باقوال الصحابة والتابعین، بصیراً بایّام الناس و اخبارهم له "تاریخ الاسلام" (تاریخ الطبری)والتفسیر الذی لم یصنف مثله(تفسیر الطبری)

یعنی: "محمد بن جریر طبری آئمہ اربعۃ کے ہم پایہ مستقل فقیہ اور امام ہیں جو کسی کی تقلید کی بجائے خود فیصل وفقیہ تھے ان کے علم وفضیلت اور معرفت دین کی بنیاد پر ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اور اپنے زمانہ میں

تمام علوم اسلامی کے جامع تھے ان جیسا ان کا کوئی ہمعصر نہیں تھا۔ کتاب خدا کے حافظ اور علم لغت کے بابصیرت، قرآن شناسی میں بہترین فقیہ، قرآن وسنّت کے عالم، اسناد حدیث میں صحیح وضعیف میں تمیز کرنے والے، اور علم ناسخ ومنسوخ کے ماہر، اور اقوال صحابہ وتابعین سے پوری طرح بابصیرت، اور علم تاریخ کے امام تھے۔ انہوں نے تاریخ اسلام پر ایک مستقل کتاب جسے "تاریخ طبری" کہا جاتا ہے، تالیف کی اور تفسیر قرآن کی سب سے جامع ومانع تفسیر "جامع البیان" لکھی کہ جس کی مثل اور کوئی تفسیر نہیں ۔"

محمد بن جریر الطبری کے حوالے سے مشہور محدث حافظ ابن حزیمہ نے کہا ہے: ما اعلم علی ادیم الارض اعلم من ابن جریر یعنی: "میں نے روئے زمین پر ابن جریر طبری جیسا عالم نہیں دیکھا"۔ البتہ بعض حنابلہ نے ان کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ابن جریر تشیع کی طرف میلان رکھتے تھے کیونکہ انہوں نے امام احمد بن حنبل کو صرف محدث کہااور فقیہ تسلیم نہیں کیا۔ بعض دیگر لوگ بھی حنبلیوں کے اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی ابن جریر طبری کو شیعہ مشہور کر دیا جبکہ حافظ ابن کثیر نے "البدایۃ والنہایۃ" میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

ودفن فی داره لان بعض عوام الحنابلة رعاعهم منعوا دفنه نهاراً ونسبوه الی الرفض، ومن الجهلة من رماه بالالحاد وحاشا من ذلک، بل کان احد آئمة الاسلام علماً وعملاً بکتاب االله وسنة رسوله[24] یعنی: "حافظ الحدیث، امام المفسرین محمد ابن جریر طبری بعض عوام حنابلہ کے ظلم کاشکار ہوئے کیونکہ ان کی نسبت تشیع کا الزام لگایا جس کیوجہ سے وہ اپنے گھر میں دفن ہوئے حالانکہ ابن جریر طبری ان تمام تہمتوں سے مبرا تھے بلکہ وہ اسلام ومسلمین کے ایک امام اور علمی وعملی اعتبار سے قرآن وسنت رسول کے جلیل القدر عالم تھے۔"

4. حافظ ابو عبداللہ الذہبی الدمشقی

چوتھے عالم بالحدیث جنہوں نے "حدیث غدیر" کو متواتر اور صحیح قرار دیا ہے، وہ مشہور مورخ ومحدّث حافظ ابو عبد اللہ الذہبی الدمشقی ہیں جن کا نام محمد بن احمد بن عثمان ہے۔ آپ کی وفات ۷۴۸ھ میں ہوئی۔ ان کی شخصیت وحیثیت ہر طالب حدیث کے ہاں مسلّم ہے۔ آپ نے رجال حدیث پر دسیوں کتب تالیف کی ہیں جن میں "سیر اعلام النبلاء" (تقریباً ۳۰ جلدوں میں)، "میزان الاعتدال" (۹ جلدوں میں اور اس موضوع پر سب سے جامع کتاب "تاریخ اسلام" (جو کہ ۵۰ ضخیم جلدوں میں جدید تحقیق و

تعلیق سے مزین ہو کر لبنان سے چھپ چکی ہے) شامل ہیں اور اسی طرح "تذکرۃ الحفاظ" (۴ جلدوں میں) جو کہ صرف حفاظ حدیث کے احوال پر ہے، نیز کتاب " الکاشف" جو کہ صرف صحاح ستہ کے رجال میں ہے، آپ ہی کی تالیفات ہیں اور بعد والے تمام محدثین انہی کی تالیفات سے استفادہ کرتے ہیں۔ حتی کہ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسا بلند پایہ محدث وفقیہ آپ کے مرتبہ تک رسائی کے لیے بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہے جن کا ذکر آیا ہی چاہتا ہے۔

5. حافظ ابن حجر عسقلانی

پانچویں نمبر حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں جنہوں نے حدیث غدیر کی بعض اسانید کو حسن اور بعض کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور حدیث غدیر کی توثیق کی ہے۔ آپ کا مکمل نام احمد بن علی بن محمد اور کنیت ابو الفضل اور محدثین اور اہل علم کے ہاں حافظ ابن حجر عسقلانی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ مسلکی اعتبار سے شافعی ہیں۔ آپ کی ولادت (۷۷۳ھ) اور وفات (۸۵۲ھ) میں ہوئی۔ آپ نے " صحیح بخاری" کی سب سے جامع اور مستند ترین شرح لکھی۔ اس کے علاوہ دسیوں کتب رجال وحدیث کے موضوع پر تالیف کی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور " تهذيب التهذيب" اور اس کا خلاصہ " تقريب التهذيب"، " لسان الميزان"، "الدرر الكامنة"، 'شرح نخبة الفكر"، "التلخيص الجير" اور " الاصابة" ہیں۔ آپ کے بارے میں حافظ جلال الدین السیوطی نے " طبقات الحفاظ" کے آخر میں لکھا ہے کہ :

شيخ الاسلام وامام الحفاظ فی زمانه، وحافظ الديار المصرية، بل حفاظ الدنيا قاضی القضاة الشافعيه، فقد انتفعت فی الفن تبصانيه، وقد استفدت منه الكثير، وقد غلق بعده هذا الباب، وختم به هذا الشان. یعنی: " ابن حجر عسقلانی شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے اور اپنے زمانہ کے تمام حفاظ حدیث کے پیشوا، مصر بلکہ مطلق طور پر پوری دنیا کے حافظ الحدیث تھے۔ مسند قضا پر فائز تھے اور میں نے ان کی تصانیف سے علم حدیث میں بہت استفادہ کیا اور علم حدیث کے بارے میں ان کے بعد یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے ہو گیا۔"

6. عماد الدین اسمٰعیل بن عمر بن کثیر

چھٹے محدث ومفسر وفقیہ ومؤرخ حافظ ابن کثیر ہیں جنہوں نے " حدیث غدیر" کی تحسین و تصحیح فرمائی اور اس کے تواتر کی بھی تاکید کی۔ آپ کا نام اسمٰعیل بن عمر بن کثیر اور کنیت ابو الفداء اور لقب عماد الدین ہے۔

شافعی المسلک ہیں۔۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔ آپ کو حافظ ذہبی، ابن تیمیہ، اور حافظ ابن القیم کی صحبت اور شاگردی کا شرف بھی حاصل ہے۔آپ نے " تفسیر قرآن" پر ایک عمدہ تفسیر بنام " تفسیر قرآن العظیم " لکھی جو کہ اہل علم کے ہاں " تفسیر ابن کثیر " کے نام سے مشہور ہے اور یہ تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر ابن ابی حاتم اور " تفسیر الدر المنثور " کی طرز پر تفسیر بالروایۃ ہے۔اسی طرح علم تاریخ پر بھی نہایت ہی جامع و ضخیم تاریخ لکھی جس کا نام "البدایۃ والنہایۃ" ہے اور اکثر اسے " تاریخ ابن کثیر " بھی کہتے ہیں۔

اسی تاریخ کی پانچویں اور ساتویں جلد میں انہوں نے حدیث غدیر کی تصحیح کی اور اسے متواتر کہا۔آپ نے حدیث کے موضوع پر " جامع المسانید والسنن" بھی لکھی ہے جو کہ کم از کم (۳۸) جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ بھی رجال وحدیث پر متعدد کتب تالیف کی ہیں۔ آپ کی نسبت حافظ ذہبی لکھتے ہیں: و الامام المفتی المحدث البارع ثقه متقن" یعنی: " ابن کثیر علوم حدیث کے امام اور فقیہ مفتی (صاحب فتویٰ) اور بلند پایہ محدّث اور ثقہ و متقن تھے۔"

7. جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر السیوطی

ساتویں محدّث و مورخ و مفسر اور فقیہ حافظ جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی ہیں جو ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۱۱ھ میں وفات پائی ۔ برادران اسلام کے ہاں ان سے بڑا کوئی ایسا مؤلف و مصنف نہیں گذرا کہ جس نے ان سے زیادہ کتب تالیف کی ہوں۔ آپ نے تمام علوم اسلامی پر کم از کم پانچ سو (۵۰۰) کتب تالیف کیں۔علم صرف، نحو، قرآت، تجوید، تفسیر وحدیث وتاریخ ورجال وسیر ومغازی و جرح وتعدیل ادب و معانی و بیان ولغۃ وادب وشروح وتعلیقات غرض کوئی ایسا فن نہیں کہ جس پر ان کی کوئی نہ کوئی تالیف مل نہ جائے۔

ان کے متعلق مشہور مؤرخ علّامہ ابن العماد حنبلی نے اپنی کتاب " شذرات الذہب" (۵۳۷) میں لکھا ہے: وكان اعلم اهل زمانه بعلم الحديث و فنونه وغريبا ومتنا وسنداً واستنباطاً للاحكام منه واخبر عن نفسه انه ماتى حديث الف حديث قالو ولو وجدت اكثر لحفظته. یعنی: "علامہ سیوطی اپنے زمانہ میں علم حدیث اور اس سے متعلق دیگر علوم رجال ولغت حدیث، متون حدیث، اسانید حدیث اور فقاہت حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔علامہ سیوطی نے اپنے بارے

میں کہا: "میں نے دو لاکھ احادیث کو یاد کیا نیز یہ کہا کہ اگر اس سے زیادہ احادیث مجھے مل جاتیں تو میں انہیں بھی حفظ کر لیتا۔" مشہور کتاب " الجامع الکبیر" جو کہ اکّیس (۲۱) ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اسی کا خلاصہ " الجامع الصغیر" ان کے اس قول کی تصدیق کرتی ہیں۔ اسی طرح مشہور تفسیر الدر المنثور" الاتقان"، " تاریخ الخلفاء"، " طبقات المحدثین" اور "الدررۃالمتناثرۃ" کے بھی مؤلف ہیں ۔ آپ مسلکاً شافعی المذہب ہیں۔

8. الاعلی بن سلطان القاری

اس کے بعد مشہور محدث وفقیہ جنہوں نے "حدیث غدیر" کی توثیق و تصحیح فرمائی، وہ الاعلی بن سلطان القاری ہیں جو حنفی المسلک ہیں۔ آپ کی وفات ۱۰۱۴ھ میں ہوئی۔ "مشکوٰۃالمصابیح" کی مشہور شرح" مرقاۃ المفاتیح" گیارہ ضخیم جلدوں میں تالیف فرمائی۔ اس کے علاوہ " انوار القرآن" بھی تالیف کی۔

9. محمد بن اسمٰعیل الیمانی

مشہور محدث علّامہ محمد بن اسمٰعیل الیمانی نے "حدیث غدیر" کو متواتر تسلیم کیا ہے۔ آپ سنۃ (۱۰۵۹) کو کحلان نامی شہر میں پیدا ہوئے اور سنۃ (۱۱۸۲ھ) میں وفات پائی۔ آپ نے حافظ ابن حجر کی کتاب " سبل السّلام" کی شرح بھی لکھی اور ابن دقیق العید کی کتاب کی شرح "العمدۃشرح العمدۃ" بھی آپ کی مؤلفہ ہے۔ اسی طرح علم اصول حدیث پر " اسبال المطر" شرح" قصب السکر" جو کہ دار السلام، سعودی عرب سے شائع ہوئی، آپ کی تصنیف ہے۔ اسی کتاب میں "حدیث متواتر" کے بیان میں "حدیث غدیر" کو متواتر کے طور پر بطور مثال پیش کیا اور پاکستان کے مشہور محدث علامہ محمد رفیق اثری نے اس پر عمدہ حاشیہ بھی لکھا ہے۔

10. قاضی ثناء اللہ پانی پتی

آٹھویں صدی کے مشہور مفسر و محدث علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ہیں جن کا تعلق ہند سے ہے۔ آپ مشہور محدث حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔ پاک وہند کے علمی حلقوں میں مسلّم شخصیت ہیں۔ آپ نے "تفسیر المظہری" کے نام پر قرآن مجید کی بہت مشہور تفسیر لکھی۔ اسی تفسیر میں آیت ولایت کے ضمن میں "حدیث غدیر" کو متواتر کہا ہے۔

11. شاہ ولی اللہ دہلوی

اسی طرح ہندوستان کے مایہ ناز محدّث وفقیہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی خاتم المحدّثین ہیں۔ آپ مشہور محدّث حضرت علامۃ الہند شاہ عبد العزیز صاحب "تحفۃ اثنا عشریہ" کے والد بزرگوار ہیں۔آپ ۱۱۷۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی۔ اپنی کتاب "ازالۃ الخفاء" میں حدیث غدیر کو متواتر تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ "حجۃ البالغۃ" اور "الفوز الکبیر" آپ ہی کی تالیفات ہیں۔

12. علامہ ناصر الدین البانی

اسی طرح عصر حاضر کے مشہور محدّث و محقق علامہ ناصر الدین البانی کہ جن کی علم حدیث پر تحقیق و تعلیق تمام اہلسنت خصوصاً اہل حدیث کے ہاں مسلم ہے۔ آپ نے پوری کتب صحاح ستہ پر بہت عمدہ تعلیقات و تحقیقات لکھی ہیں اور موجودہ زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا محقق اہل حدیث کے ہاں موجود نہیں ہے۔آپ کے دسیوں شاگردوں نے کتب حدیث و کتب تاریخ ورجال پر عمدہ حواشی وتعلیقات لکھیں۔ آپ نے اپنی کتاب "سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ" کے متعدد مقام پر نہ صرف حدیث غدیر کو متواتر کہا بلکہ اس کی اکثر اسانید کو صحیح وحسن بھی کہا۔ نیز جن لوگوں نے حدیث غدیر کی صحت میں کلام کیا، ان کو بھی رد کیا۔ حتی کہ ایک مقام پر علامہ ابن تیمیہ پر بھی نقد وجرح کی ہے کیونکہ انہوں نے حدیث غدیر کی صحت میں کلام کیا ہے، جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

حدیث غدیر پر اہل سنّت علماء کی تالیفات

سوال نمبر 9: کیا کسی مستند عالم اہل السنّۃ یا ماہر علم رجال وحدیث نے "حدیث غدیر" پر کوئی کتابچہ یا مستقل کتاب لکھی ہے کہ جس میں اس کی تمام اسانید وطرق کو جمع کیا ہو؟

جواب: حدیث غدیر کے موضوع پر برادران اسلام کے بلند پایہ محدّثین ومفسّرین و مؤرخین نے کئی کتب تالیف کی ہیں جن میں سے چند ایک کو ہم بطور اختصار ذکر کرتے ہیں:

1. حافظ ابن جریر طبری

سب سے پہلے مشہور مفسّر و محدّث وفقیہ حافظ ابن جریر طبری ہیں جن کا ذکر گذشتہ بحث میں گزر چکا ہے۔آپ نے "کتاب الولایۃ" یا "کتاب الموالاۃ" کے نام سے ضخیم کتاب تالیف کی ہے جس میں انہوں نے "حدیث غدیر" کو کم از کم پچھتّر (۷۵) صحابہ سے باسانید صحیحہ نقل کیا ہے۔ جیسا کہ اس کا تذکرہ حافظ ابن کثیر دمشقی نے "البدایۃ والنہایۃ" جلد ۱۱ صفحہ ۱۱۱پر ابن جریر طبری کے حالات میں کیا ہے۔ چنانچہ لکھا

ہے:وقد رایت له کتاباً جمع فیه احادیث غدیر خم فی مجلّدین ضخیمین یعنی: "میں نے امام ابن حریر طبری کی تالیف کردہ "کتاب الولایۃ" دو ضخیم میں جلدوں میں دیکھی جس میں انہوں نے "حدیث غدیر" کی اکثر اسانید وطرق کو جمع کر دیا۔"

نیز "البدایۃ والنہایۃ" جلد ۵ صفحہ ۴۹ پر ابن جریر طبری کی "کتاب الولایۃ" کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:وقد اعتنی بامر هذا الحدیث ابو جعفر محمد بن جریر الطبری صاحب "التفسیر و التاریخ" مجمع فیه مجلدین اورد فیهما طرقه و الفاظه یعنی: "صاحب تاریخ و تفسیر ابو جعفر طبری نے "خدیث غدیر خم" کے موضوع پر دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے حدیث غدیر کی جملہ اسانید و طرق کو جمع کر دیا۔" ابن جریر کی مذکورہ کتاب الولایۃ کا تذکرہ علّامہ یمانی نے اپنی کتاب "اسبال المطر" صفحہ ۲۷ پر حدیث متواتر کی بحث میں کیا ہے جس کی طرف گذشتہ سوال کے ضمن میں اشارہ گذر چکا ہے۔اسی طرح مشہور محدث و مؤرخ حافظ ذہبی نے بھی ابن جریر کی "کتاب الولایۃ" کا ذکر اپنی کتاب "تذکرۃ الحفاظ" جلد ۲ صفحہ نمبر ۲۰۱ میں جریر کے حالات میں ان الفاظ میں کیا ہے: قلت : رایت مجلّداً من طرق الحدیث لابن جریر فاندهشت له ولکثرة لتلک الطرق یعنی: "میں نے ابن جریر طبری کی کتاب "الولایۃ" کو دیکھا اور اس میں "حدیث غدیر" کی کثرت اسانید کو دیکھ کر میں دہشت زدہ ہو گیا۔"

2. حافظ ابو عبد اللہ ذہبی

اس کے علاوہ خود حافظ ابو عبد اللہ ذہبی نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جیسا کہ علامہ سمٰعیل الامیر الیمانی نے اپنی کتاب "اسبال المطر" میں اس کا تذکرہ کیا ہے: و صنف الذهبی جزاً فی طرقه وحکم بتواتره " حافظ ذہبی نے "حدیث غدیر" کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا جس میں انہوں نے "حدیث غدیر" کی اسانید کو جمع کر دیا اور اس پر حدیث متواترہ کا حکم لگایا۔" ایران میں اس کا نسخہ چھپ چکا ہے۔

3. ابن عساکر دمشقی

اسی طرح حافظ الدنیا ابو القاسم ابن عساکر دمشقی نے اپنی مشہور کتاب " تاریخ مدینہ ودمشق" جو کہ کم از کم ستّر (۷۰) ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے، کی بیالیسویں جلد میں "حدیث غدیر" کی اکثر اسانید کو جمع کر دیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے " البدایۃ والنہایۃ" (۱۴۹۵) پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

4. حافظ ابن عقدہ

اسی طرح مشہور محدث وحافظ الحدیث علامہ احمد بن محمد بن سعید الہمدانی المعروف حافظ ابن عقدہ نے "حدیث غدیر" پر سب سے عمدہ وجامع کتاب " الولایۃ" تحریر کی جس میں انہوں نے "حدیث غدیر" کو تقریبا ایک سو پچاس صحابہ کرام سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ علامہ الامیر الیمانی نے " اسبال المطر" صفحہ نمبر ۲۸ پر حدیث متواتر کے ضمن میں ان الفاظ سے ذکر کیا ہے: وذکر ابو العباس ابن عقدہ"حدیث غدیر خم من ماۃوخمسین طریقاً، وافرد لہ کتاباً حافظ ابن عقدہ کی مذکورہ تالیف کا ذکر دسیوں محدّثین اور علماء رجال نے کیا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "فتح الباری، شرح صحیح بخاری" جلد ۷ صفحہ نمبر ۱۹۳ اور "تہذیب التہذیب" میں امیر المؤمنین الامام علی بن ابی طالبؑ کے حالات میں اس کا ذکر کیا ہے۔اور مشہور محدّث علّامہ عبد الرؤف مناوی نے " فیض القدیر" جلد۶، صفحہ نمبر ۲۸۲ حدیث نمبر ۹۰۰۰ کی شرح میں ابن عقدہ کی مذکورہ کتاب الولایۃ کا ذکر کیا ہے۔

البتہ بعض حضرات نے ابن عقدہ سے متعلّق یہ مشہور کر دیا کہ یہ شیعہ بلکہ رافضی تھے۔ حالانکہ حافظ ابو عبد اللہ ذہبی اور حافظ ابن کثیر جیسے محتاط محدثین نے اسے بلند پایہ محدث قرار دیا ہے، جیسا کہ "سیر اعلام النبلاء" جلد ۵ صفحہ ۳۴۱ میں حافظ ذہبی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے: ابوالعباس الکوفی الحفظ العلّامہ احد اعلام الحد یث ونادرۃ الزّمان وھو المعروف بالحافظ ابن عقدہ اور صفحہ نمبر ۳۴۳ پر اس کے تشیّع پر بحث کرتے ہوئے یوں دفاع کیا: قلت: قد رمی ابن عقدہ بالتشیّع ولکن روایتہ لھذا ونحوہ یدل علی عدم علوہ فی تشیعہ. یعنی: "اگرچہ حافظ ابن عقدہ پر تشیع کا الزام لگایا گیا ہے لیکن ان کی اس طرح کی روایات اس کے علو کی نفی کرتی ہیں۔" نیز لکھتے ہیں: و من بلغ فی الحفظ والآثار مبلغ ابن عقدہ، ثم یکون فی قلبہ علی السابقین الاولین فھو معاند او زندیق. یعنی: "اگر کوئی محدّث یا عالم حفظ احادیث وآثار صحابہ میں ابن عقدہ کے مقام پر فائز ہو یعنی ابن عقدہ کا ہم پایہ ہو اور پھر بھی اس کے دل میں سابق الی الاسلام صحابہ کرام کے بارے میں بغض وغیرہ ہو تو وہ زندیق اور بے دین ہے۔"

حدیث غدیر پر جرح کا جائزہ

سوال نمبر10: کن علل واسباب کی وجہ سے بعض علماء اہل السنّۃ نے "حدیث غدیر" کو ضعیف قرار دیا ہے؟

جواب: برادران اسلام کے جن بزرگوں نے "حدیث غدیر" کی صحت میں کلام کیا ہے ان میں سے علامہ ابن تیمیہ اور ابن حزم پیش پیش ہیں۔ ان ہر دو بزرگوں نے حدیث غدیر کی صحت سے انکار کے لیے معقول وجہ تو دور کی بات ہے، کوئی نامعقول سبب بھی پیش نہیں کیا۔ ہم سب سے پہلے علامہ ابن حزم اور ابن تیمیہ کا مقام و منزلت کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ خود کس قدر ماہرین نقد و رجال ہیں یا ان کی جرح کا محدثین کے ہاں کیا مقام ہے۔ اس کے بعد ہم ان کی "حدیث غدیر" پر جرح اور اس کے علل واسباب کو ذکر کریں گے۔

جرح وتعدیل میں ابن تیمیہ کا مقام

ابن تیمیہ محدثین کے ہاں نہ تو ائمہ جرح وتعدیل میں سے ہیں اور نہ ہی ان کی جرح کو محدثین نے تسلیم کیا ہے بلکہ اکثر محدثین نے تو ابن تیمیہ کو ان بزرگوں کی صف میں شمار کیا ہے جن کی جرح کا نہ اعتبار ہے اور نہ ہی کوئی معیار ہے۔ بلکہ الٹا اسے متعصب، متعنت اور در باب جرح متشدد قرار دیا ہے جیسا کہ یہ بات علم حدیث کا ادنی طالب علم بھی جانتا ہے۔ مثلاحضرت مولانا خیر محمد جالندھری نے اپنے رسالہ "خیر الاصول فی حدیث الرسول" کے صفحہ ۱۱ پر ابن تیمیہ کو ان حضرات میں شمار کیا ہے کہ جو جرح میں متعنت شمار ہوتے ہیں اور جن کی جرح از روئے قواعد حدیث باطل ومردود ہے۔

ابن تیمیہ کی مشہور تالیف کہ جسے "منہاج السنۃ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کتاب میں انہوں نے جس قدر احادیث نبوی (ص) کی تحقیر وتوہین کی ہے اس کی مثال "منکرین حدیث" میں بھی ملنا مشکل ہے۔ نیز در باب فضائل اہل بیت رسالت جن متواتر، صحیح اور ثابت شدہ احادیث کو رد کیا ہے اس بارے میں انہوں نے اصول حدیث، علم جرح، وتعدیل کے علاوہ جملہ قواعد واصول کو باطل ولایعنی قرار دیا ہے۔ اور اس مسئلہ میں تو" منکرین حدیث" کے لیے تمام دروازے کھول دیے۔ ان شاء اللہ ہم اس موضوع کو "تبصرہ بر منہاج السنۃ" اور "منہاج لکرامۃ" کی تعلیقات میں ذکر کریں گے۔ بطور اختصار ان کی کتاب "منہاج السنۃ" پر مشہور محدّث، حافظ ابن حجر عسقلانی" صاحب فتح الباری" کے تاثرات ذکر کرتے ہیں تاکہ 'منہاج السنۃ" کا معیار اور ابن تیمیہ کی حدیث شناسی ہر عام وخاص پر ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ وہ علامہ حلی کے حالات میں صاحب "منہاج السنۃ" پر یہ تبصرہ کرتے ہیں:

طالعت الرّد المذکور فوجدته کما قال السّبکی فی "الإستیفاء" لکن وجدته کثیر التحامل إلی الغایة فی ردّ الاحادیث التی یوردها ابن المطهر وان کان ذلک من الموضوعات الواهیات

لکنّه ردّه فی ردّه کثیراً من الاحادیث الجیاد التی لم تستحضر حالته التصنیف مظانها لانّه کان لإتساعه فی الحفظ یشکل علی ما فی صدوره والإنسان عامد للنسیان وکم من مبالغة لتوهین کلام الرافضی ادته احیانا إلی تنقیص علیؑ[25]

یعنی ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "منہاج السنۃ" جو انہوں نے علامہ حلیؒ کی کتاب "منہاج الکرامۃ" کے رد میں لکھی اس میں انہوں نے بہت سی صحیح اور ثابت شدہ احادیث نبویہؐ کو رد کر دیا، "منہاج السنۃ" کی تالیف کے وقت ان احادیث کے مصادر موجود نہ تھے۔ ابن تیمیہ نے اصل مصادر حدیث کو دیکھنے کی بجائے صرف اپنے حافظہ کو کافی سمجھا جبکہ انسان تو آماجگاہ نسیان ہے اور اس نے علامہ حلیؒ کے کلام کی رد کرتے ہوئے امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی توہین کا ارتکاب کیا۔ اسی طرح مشہور محدث مولانا ظفر احمد عثمانی الحنفی نے اپنی کتاب "قواعد علوم الحدیث" صفحہ نمبر ۱۹۱ میں ابن تیمیہ کو در باب جرح متشدد قرار دیا ہے۔ نیز صفحہ نمبر ۱۶۸ پر ابن تیمیہ کو ان حضرات میں شمار کیا ہے کہ جو اپنی کتب میں کسی حدیث کو ضعیف قرار دینے میں اسباب و علل کی پرواہ نہیں کرتے۔ چنانچہ لکھا ہے: ابن تیمیه وغیرهم فإنک تراهم فی کتبهم یجترحون ویضعفون دون بیان السبب.

ابن تیمیہ کی جرح کا جائزہ

جہاں تک ابن تیمیہ کی جرح کا تعلق ہے تو وہ اپنی کتاب "منہاج السنّۃ" جلد ۴ صفحہ ۸۶ میں حدیث غدیر پر جرح اور دلائل جرح کو اس طرح ذکر کرتے ہیں: واما من کنت مولاه فعلی مولاه، فلیس فی الصحاح لکن هو مما رواه العلماء و تنازع الناس فی صحته۔ فنقل عن البخاری وإبراهیم الحربی و طائفة من اهل العلم بالحدیث انهم طعنوا فیه وضعّفوه، وقال ابن حزم: واما من کنت مولاه فعلی مولاه فلا یصحّ من طریق الثقات اصلاً.

یہاں ابن تیمیہ نے "حدیث غدیر" کی صحت کا انکار "فلیس هو فی الصحاح " کہ کر کیا ہے پھر استشہاد کی خاطر امام بخاری اور ابراہیم حربی کے علاوہ ابن حزم کے قول کو پیش کیا ہے۔ اب ہم تفصیل سے ابن تیمیہ کے خود ساختہ قول "فلیس هو فی الصحاح " پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے بعد امام بخاری اور ابراہیم حربی اور ابن حزم کے اقوال کا جائزہ لیں گے۔ قول ابن تیمیہ: فلیس فی الصحاح لکن هو مما رواه العلماء حدیث غدیر کتب صحاح وغیرہ میں روایت نہیں کی گئی بلکہ اسے بعض دیگر علماء سے روایت کیا

ہے۔"اب اہل علم خصوصاً اہل حدیث ہی اس کا فیصلہ کریں کہ ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ "حدیث غدیر" کتب صحاح میں نہیں پائی جاتی اور کتب صحاح سے مراد صرف "صحیح بخاری اور صحیح مسلم" ہیں یا اس کے علاوہ اور کتب احادیث بھی صحاح میں شامل ہیں؟

یہاں ابن تیمیہ نے کتب صحاح کی تعیین نہیں کی، حالانکہ یہ حقیقت علم حدیث کا طالب اور خصوصا دورہ حدیث کرنے والا ہر طالب علم بھی جانتا ہے کہ بخاری شریف اور مسلم شریف کے علاوہ بھی کتب احادیث کو محدثین نے کتب صحاح میں شمار کیا ہے۔ کیا محدثین نے "صحیح ابن حبّان، صحیح ابن خزیمہ، المنتقی ابن جارود، جامع الترمذی، مستدرک حاکم کے علاوہ کئی دیگر کتب احادیث پر صحاح کا اطلاق نہیں کیا؟ کیا صحاح ستہ کی دیگر کتب، ترمذی شریف، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، اور سنن ابن ماجہ میں صحیح احادیث نہیں ہیں؟ اگر ابن تیمیہ کی صحاح سے مراد صرف بخاری و مسلم ہی ہیں کہ تمام صحیح احادیث کو انہی دو کتب میں جمع کر دیا گیا ہے اور ان دو کتب سے باہر ذخیرہ احادیث کی دیگر کتب مسانید ومعاجم و سنن وجوامع و مستدرکات و مصنفات وغیرہ میں صحیح احادیث نہیں پائی جاتی تو ان کا یہ نظریہ نہ صرف بخاری و مسلم کے نظریات سے مختلف ہے بلکہ یہ خود ابن تیمیہ کے علم حدیث سے تہی دامن ہونے کا ثبوت ہے۔ سوال نمبر ۴ کے ضمن میں امام بخاری اور امام مسلم کے خود اپنی کتب کے بارے میں یہ نظریہ گذر چکا ہے کہ جسے علم حدیث کی سب سے مستند کتاب ترین کتاب "مقدمہ ابن صلاح" کی پہلی نوع میں ذکر کیا گیا ہے، اسے ہم دوبارہ بطور خلاصہ بیان کئے دیتے ہیں: ولم یستوعبا الصحیح ولا التزاما یعنی: "تمام صحیح احادیث کو بخاری و مسلم نے اپنی کتب (صحیحین) میں جمع نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے اس کو لازمی سمجھا۔"

چنانچہ خود امام بخاری کا یہ قول موجود ہے: ترکت من الصحاح اکثر یعنی: "میں نے بہت سی صحیح احادیث کو ترک کر دیا اور بہت کم صحیح احادیث کو اپنی کتاب "الجامع الصحیح" میں ذکر کیا ہے۔" نیز امام بخاری کا یہ قول: احفظ مائة الف حدیث وجملة ما فی کتابه سبعة آلاف ومائتان و خمسة وسبعون حدیثاً کہ انہوں نے ایک لاکھ صحیح احادیث کو یاد کیا تھا، جبکہ اپنی کتاب میں صرف ۷۲۷۵ احادیث کو داخل کیا۔ اب ابن تیمیہ ہی فیصلہ کر دیتے کہ بقیہ تقریبا ۹۲۷۲۵ احادیث صحیحہ کہاں چلی گئیں؟ کیا محدثین وحفاظ نے کتب اصول حدیث میں یہ وضاحت نہیں کر دی: ثم ان الزیادة فی الصحیح تعرف من السنن المعتدة کسنن ابی داؤد والترمذی والنسائی وابن حزیمه والدار قطنی و الحاکم والبیهقی

وغیرها منصوصا علی صحته دیکھو"تدریب الراوی" صفحہ ۹۳مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۵ کتاب " التقریب" صفحہ ۲۹کہ بخاری و مسلم سے رہ جانے والی احادیث مستند کتب احادیث سنن ابی داؤد، جمع ترمذی شریف، سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ، تالیفات دار قطنی، مستدرک حاکم اور تالیفات ابو بکر بیہقی وغیرہ میں ہیں اور ان میں سے اکثر نے اپنی کتب کی روایات کو صحیح بھی قرار دیا ہے۔

باقی یہ بھی مسلّم ہے کہ صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر کتب احادیث میں اگرچہ صحیح احادیث کے علاوہ احادیث حسن وضعیف بھی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی بقیہ احادیث غیر مقبول ہیں۔ البتہ ان کتب کی وہ احادیث جو علم حدیث ورجال کی رو سے ثقہ وعادل رواۃ سے مروی نہیں وہ اپنے مقام پر صحیح ہیں، ان کو اپنی خواہش نفس یا تاویلات باطلہ سے رد کر دینا جہاں تک قواعد حدیث کو غلط کرنا ہے، وہاں پر انکار حدیث کا دروازہ بھی کھولنا ہے جو کسی مسلمان کے شایان شان نہیں۔ جبکہ ابن تیمیہ خود اپنی کتاب "منہاج السنّۃ" کے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ در باب حدیث کتب صحاح کے علاوہ کتب سنن و مسانید و معاجم پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ " منہاج السنۃ " (۳ ۲۵) پر لکھا ہے: الکتب التی یعتمد فی الحدیث علیها کالصحاح والسنن والمسانید مع ان فی بعض هذا ما هو ضعیف بل ما یعلم انه کذب لکن هذا قلیل جداً یعنی: "کتب صحاح و سنن و مسانید میں اگرچہ بعض ضعیف احادیث ہیں تاہم در باب حدیث اعتماد انہی کتب پر کیا جاتا ہے، لیکن ان کتب میں کسی موضوع حدیث کا ہونا یہ بہت ہی نادر ہے۔" نیز جلد ۴ صفحہ ۱۰۶ پر بھی اس مضمون کا تکرار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: کتب الحدیث التی یعتمد علیها علماء لحدیث لا الصحاح ولا المسانید والسنن والمعجمات ونحو ذلک من الکتب.

اب اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔ کیا حضرت ابن تیمیہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ جو احادیث امام بخاری و مسلم کی شرائط پر پوری اترتی ہیں اور جسے محدّثین کی اصطلاح میں " صحیح علی شرط الشیخین "کہا جاتا ہے، صحیح احادیث ہیں؟ اور " جامع ترمذی شریف " (کہ جو داخل صحاح ستہ ہے) سے " حدیث غدیر "، جس کی سند کے تمام راوی بخاری شریف و مسلم ہر دو کے رجال سے ہیں اور امام ترمذی نے یہ حدیث باب فضائل علی بن ابی طالبؑ حدیث نمبر ۳۷۲۲ پر اس سند سے ذکر کی ہے: حدثنا محمد بن بشار، حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبه، عن سلمةبن کهیل، قال:سمعت ابا الطفیل، یحدث عن ابی مریحة او زید بن ارقم، عن النبیّ(ص)، قال: "من کنت مولاه فعلیّ مولاه".

اس حدیث کی صحت اور اسناد کی تفصیلی بحث سوال نمبر ۴ کے ضمن میں گذر چکی ہے۔ حدیث مذکورہ کی سند میں ایک راوی بھی ایسا نہیں کہ علم جرح و تعدیل کی رو سے ضعیف ہو یا بخاری و مسلم کے رواۃ میں سے نہ ہو۔ تو کیا ابن تیمیہ کو ترمذی شریف سے یہ حدیث نظر نہیں آئی کہ جو "صحیح علی شرط الشیخین" پر پوری اترتی ہیں۔ حالانکہ ابن تیمیہ نے "منہاج السنۃ" کے اسی صفحہ پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ "حدیث غدیر" کو امام ترمذی حتی کہ خود ان کے مقتدا و پیشوا امام احمد بن حنبل نے "حدیث حسن" قرار دیا ہے۔ تو کیا امام احمد اور امام ترمذی ابن تیمیہ کے ہاں اہل علم میں شمار نہیں ہوتے؟ حالانکہ ابن تیمیہ ابن تیمیہ، امام احمد بن حنبل کی پیروی کی وجہ سے حنبلی کہلاتے ہیں۔

باقی رہا ابن تیمیہ کا اپنے موقف کی تائید کے لیے امام بخاری یا ابراہیم حربی کے قول کا سہارا لینا کہ: فنقل عن البخاری و إبراهيم الحربی وطائفة من اهل العلم بالحديث انهم طعنوا فيه وضعفوه.[26] تو یہ بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کی مثال ہے۔ کیونکہ امام بخاری نے "متن حدیث غدیر" کی صحت میں کلام کیا ہے اور نہ ہی حدیث مذکورہ کی تمام اسانید کے رواۃ کو ضعیف یا مجروح قرار دیا ہے؛ جبکہ ابن تیمیہ نے امام بخاری کے قول میں تدلیس کرکے پیش کیا ہے ورنہ امام بخاری نے اپنی کتاب "التاریخ الکبیر" جلد ۱ صفحہ نمبر ۳۷۵ میں اسمٰعیل بن نشیط کے حالات میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے جس کی اصل سند و متن یوں ہے: قال البخاری، قال لی عبید، حدثنا یونس سمع اسمٰعیل، عن جمیل بن عامر ان سالما حدثه من سمع النّبی ، یقول یوم غدیر خم: "من کنت مولاه فعلیّ مولاه".

اس کے بعد امام بخاری اس سند حدیث پر ان الفاظ میں جرح کرتے ہیں: وفی اسناده نظر. امام بخاری کی مذکورہ جرح کو علم حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ مذکورہ حدیث کی سند اسماعیل بن نشیط کی وجہ سے ضعیف جبکہ یونس اور اسماعیل کے مابین عدم اتصال کی وجہ سے منقطع ہے۔ لہٰذا امام بخاری کا مذکورہ سند کے بارے میں یہ کہنا: وفی اسناده نظر صحیح ہے، لیکن اس سے یہ تاثر لینا کہ امام بخاری نے "حدیث غدیر" کی تمام اسانید کو ضعیف قرار دیا ہے یا اس کے متن حدیث کو رد کر دیا، یہ حقائق کو مسخ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ باقی امام بخاری جیسے محتاط محدّث سے یہ بعید ہے کہ وہ حدیث غدیر کے تمام رواۃ کو ایک ہی سانس میں مجروح قرار دے دیں۔ کیونکہ حدیث ہذا کی کئی اسانید صحیح بخاری و مسلم شریف کے رجال سے روایت کی گئی ہیں۔ (اور ہم نے حدیث غدیر کی وہ اسانید جو صحیح علی شرط الشیخین پر ہیں، ان

کو ایک علیحدہ رسالہ میں جمع کر دیا ہے)۔لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ امام بخاری اپنی "الجامع الصحیح" کے رجال کو ضعیف قرار دیں؟ کیونکہ یہ چیز صحیحین کی صحت کو مشکوک بنا دیتی ہے۔

باقی رہا ابن تیمیہ کا ابراہیم حربی کے قول کو بطور دلیل پیش کرنا تو چونکہ ابراہیم حربی پر ہم مطلع نہیں ہو سکے لہٰذا یہ ابن تیمیہ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ ابراہیم حربی کی جرح بر حدیث غدیر کو پورے طور پر مع سند و متن نقل کرتے تاکہ اصل علم پر ان کی جرح واضح ہو جاتی کہ آیا وہ جرح مفسر ہے یا جرح غیر مفسر؟ان شاء اللہ اگر ہم ابراہیم حربی کی جرح پر مطلع ہوئے تو اس کا بھی جواب باصواب عرض کریں گے۔

حدیث غدیر پر علامہ ابن حزم ظاہری کی جرح

ابن تیمیہ کے علاوہ علامہ ابن حزم ظاہری نے بھی اپنی کتاب " الفصل فی الملل والاهواء والنحل" جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۱۶ میں "حدیث غدیر" پر جرح کی ہے جسے ابن تیمیہ نے " منہاج السنۃ" جلد ۴ صفحہ نمبر ۸۶ پر ذکر کیا ہے۔ابن حزم کا قول یہ ہے: اما حدیث "من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ" فلا یصح من طریق الثقات اصلاً[27] یعنی: " حدیث غدیر کسی ایک سند سے کہ جس کے راوی ثقہ و عادل ہوں، بھی ثابت نہیں ہے۔"

چاہیے تو یہ تھا کہ ابن حزم سب سے پہلے "حدیث غدیر" کی تمام اسانید و متون کو ذخیرہ احادیث سے جمع کر کے اہل علم کے سامنے لاتے، پھر ہر سند میں اسباب جرح و تعدیل کے رو سے نشاندہی کرتے کہ ہر حدیث کی سند میں فلاں راوی کذاب، وضاع، دجال، متروک یا ضعیف الحدیث ہے تاکہ ہر طالب حدیث ان کے علم بالحدیث میں تبحر کی داد دیتا کہ واقعی ابن حزم صاحب علوم حدیث و رجال میں بہت راسخ ہیں۔ لیکن انہوں نے تو سرے سے یہ زحمت بھی نہیں فرمائی۔ کم از کم انہیں اس موضوع پر مستقل کتاب یا کتابچہ لکھنا چاہئے تھا۔ بالفرض اگر ہم امام بخاری کی جرح پر سکوت ہی اختیار کر لیں تو بھی یہ کہاں لکھا ہے کہ امام بخاری نے "حدیث غدیر" کی صحت کا مطلقاً انکار کیا ہے۔

*****

حوالہ جات

1 ۔ صحیح مسلم، جلد ۲ صفحہ ۲۷۹ باب مناقب الامام علیؑ۔
2 ۔ مقام غدیر خم سے متعلق مزید معلومات کتاب معجم البلدان ج : ۲، ص : ۲۴۸ پر موجود ہیں۔
3 ۔ جامع الترمذی الشریف، کتاب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالبؑ۔ حدیث نمبر : ۳۷۲۱۔
4 ۔ ایضا : حدیث نمبر ۳۷۲۲ ۔
5 ۔ سنن ابن ماجۃ، باب مناقب علیؑ، حدیث نمبر ۱۲۱۔
6 ۔ ایضا، صفحہ ۳۰ حدیث نمبر ۱۱۶۔
7 ۔ جامع الترمذی الشریف، کتاب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالبؑ، حدیث نمبر ۳۷۲۲۔
8 ۔ سنن ابن ماجۃ، باب مناقب علیؑ، صفحہ ۳۰، حدیث نمبر : ۱۱۶۔
9 ۔ ایضا، صفحہ ۳۱، حدیث نمبر ۱۲۱۔
10 ۔ حافظ ابن کثیر الدمشقی، الباعث الحثیث، صفحہ ۳۵ ۔
11 ۔ النسائی، السنن الکبریٰ، جلد ۵، صفحہ ۱۳۰، حدیث نمبر ۸۴۶۶۔
12 ۔ ایضا، ۵-۱۳۰، حدیث نمبر ۸۴۶۵ ۔
13 ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد نمبر ۷ ، صفحہ نمبر ۹۳، باب مناقب علی بن ابی طالبؑ۔
14 ۔ برہان الدّین الحلبی الشافعی، سیرۃ الامین والمامون، جلد ۳، صفحہ ۳۰۸۔
15 ۔ حافظ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، صفحہ ۴۱۵۵۔
16 ۔ حافظ ذہبی، تاریخ الاسلام، صفحہ نمبر ۳۳۸۔
17 ۔ ایضا، سیر اعلام النبلاء، جلد ۸، صفحہ ۳۳۵۔
18 ۔ حافظ ابن کثیر دمشقی، البدایۃ النہایۃ، صفحہ : ۱۵۳۵۔
19 ۔ ملا علی القاری الحنفی ، مرقاۃ المفاتیح، جلد ۱۱ صفحہ ۳۴۲۔
20 ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، إزالۃ الخلفاء عن خلافۃ الخلفاء، جلد ۲ ، صفحہ نمبر ۲۶۰ ، باب مناثر الامام علی ابن ابی طالب۔
21 ۔ محمد بن اسماعیل الامیر الیمانی، اسبال المطر، صفحہ : ۲۸۔
22 ۔ اسماعیل بن محمد الشافعی، کشف الخفاء، جلد ۲ ، صفحہ : ۲۷۴، حدیث نمبر ۲۵۹۱ ۔
23 ۔ الدکتور حسین سلیم اسد، موارد الظمان ا لی زوائد ابن حبان، صفحہ : ۴۳۹، حدیث : ۶۸۹۱۔
24 ۔ حافظ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ص ۱۱۰-۱۱۱۔
25 ۔ ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان، جلد ۷، صفحہ نمبر ۵۲۹۔
26 ۔ ابن تیمیہ، منہاج السنۃ، ص ۸۶۴۔
27 ۔ ایضا، جلد ۴ صفحہ نمبر ۸۶۔

توحید عملی اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات

Practical Monotheism and its Effects on Human Life

حجۃالاسلام سید ثمر علی نقوی

لغت میں ''توحید '' سے مراد خدا کو ایک ماننااور خدا کے ایک ہونے پر یقین کرنا ہے جب کہ اسلامی اصطلاح میں توحید کا لفظ ایک وسیع معنی کا حامل ہے۔ توحید یعنی خداوند متعال تمام کائنات کا خالق، مالک، رازق، مدیر ومدبراور سرپرست ہے۔قرآن مجید اور احادیث معصومینؑ نے سب سے زیادہ جس مسئلہ کو بیان کیا ہے، وہ ''توحید '' ہے۔ توحید پر ایمان کے بغیر انسان انسانیت سے انسان خارج ہو جاتا ہے۔اسلامی عقائد میں عقیدۂ توحید تمام عقائد کی اصل، اساس، مرجع اور محور ہے۔ عقیدہ کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ اگر عقائد پختہ اور یقینی ہوں تو اس کے اثرات اعمال و کردار پر مترتب ضرور ہوں گے۔ عقائد صرف ہمارے ذہن کی خوشی یا تسکین دل کے لیے بیان نہیں کیے گئے، بلکہ یہ عقائد انسانی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ بالخصوص ''توحید '' انسان کے لیے ایک کامیاب زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے اور اسے متوجہ کرتی ہے کہ وہ شخص جو خدائے یکتا اور عظیم صفات کی مالک ہستی سے مرتبط ہے، اس کا عمل کیسا ہونا چاہیے۔ اس طرح وہ معاشرہ جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تحت قائم ہے، اس کا طرز عمل کیا ہو؟ عقائد کو قبول کرنے کے ساتھ ہی عمل کا مرحلہ آتا ہے کہ جسے قبول کیا ہے اس پر عمل کی پابندی بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اسلامی عقائد صرف ذہن تک محدود و مقید نہیں ہونے چاہیں بلکہ انسانی زندگی میں عملی طور پر رائج ہونا چاہئیں۔

ایک موحّد انسان کے اعمال و حرکات کو الٰہی صفات کا مظہر ہونا چاہیے۔توحید پر راسخ ایمان کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان میں احساس ذمہ داری پیدا ہو جاتا ہے مثلاً جب کوئی شخص اس بات پر معتقد ہو کہ اسے اور پوری کائنات کو پیدا کرنے والی ہستی یکتا ہے نیز علم قدرت، حیات اور ہدایت کا سرچشمہ وہی ایک ذات ہے، تو ایسا مومن شخص اپنے امور میں نہایت درجہ احتیاط سے کام لیتے ہوئے خود کو ایسی ذات والا صفات کا نیاز مند سمجھے گا۔ پھر اسی ہستی کے نظام ہدایت کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کے لیے سرگرم رہے گا۔جب اسے یقین ہوگا کہ حیات و موت کا سرچشمہ یہی ذات ہے اور اسے ایک مقصد کے لیے خلق کیا گیا ہے۔ تو پھر اس کے اعمال فضول اور بیہودہ نہیں ہونگے۔ہمیشہ متوجہ رہے گا کہ وہ اس دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے لیے

خلق کیا گیا ہے جہاں اسے خدا کے حضور پیش ہونا ہے: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ([1]) یعنی: ''ہم خدا کے لیے ہیں اور ہم نے خدا کی طرف جانا ہے۔''

لہٰذا اپنے فرائض و ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی نہایت درجہ کوشش کرے گا تاکہ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتے وقت شرمساری کا منہ نہ دیکھنا پڑے اس موضوع کی تکمیل کے لیے توحید کی مختصر وضاحت نہایت ضروری ہے۔ علمائے علم کلام کے درمیان یہ چیز معروف ہے کہ توحید کے اصلی وبنیادی شعبے اور قسمیں چار ہیں :

۱۔ توحید ذات یعنی خدا کی ذات یکتا اور بے مثال و بے نظیر ہے۔

۲۔ توحید صفات یعنی تمام صفات کا مرجع صرف ایک ہی ہے۔

۳۔ توحید عبادت یعنی عبادت و پرستش کے لائق یہی ذات ہے۔

۴۔ توحید افعال یعنی خلقت کائنات نیز اس مخلوق کی تدبیر کا انتظام اسی واحد ہستی کی جانب سے ہے اور تمام حرکات وافعال کا مبداء خدا ہے پھر توحید افعالی کی بھی کئی اقسام ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہیں :

''توحید خالقیت، توحید ربوبیت، توحید مالکیت، توحید حاکمیت، توحید اطاعت

پس توحید یعنی ''موثر حقیقی ''اللہ ہے: ''لاموثر فی الوجود الّا اللہ'' توحید یعنی ہر قسم کے طاغوت کی نفی، توحید یعنی طاغوتی نظاموں پر خط بطلان کھینچنا (لا شرقیہ ولا غربیہ)۔ توحید یعنی ان تمام رشتوں کو توڑنا جو مسلمانوں کے لئے اغیار کی بالادستی و تسلط کا سبب بنیں۔ توحید یعنی کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرنا جس کا حکم خدا کی حدود کے مطابق نہ ہو۔ توحید یعنی صرف ایسے افراد کی رہبری قبول کرنا جن کی رہبری کو خدا نے پسند فرمایا ہے۔ توحید یعنی صرف 'خدائے لایزل ولایزال ' کی بندگی کرنا اور ہر قسم کی غلامی (خواہشات واستعمار) کا طوق اتار دینا۔ المختصر توحید یعنی انسان کا اٹھنا بیٹھنا بلکہ ہر عمل خدا کے لئے ہو اور وہ ایسا معاشرہ تشکیل دے جس میں صرف خدا کی حکم فرمائی ہو۔ توحید پرست انسان جب اپنے دل و دماغ میں ان تمام اقسام کو بٹھاتے ہوئے اسے روح کی غذا قرار دے گا تو ایسی روح کے اثرات اس کے اعمال کردار اور افعال وحرکات میں ضرور ظاہر ہوں گے۔

۱۔ محبت خدا

انسان کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ کمال مطلق کا خواہش مند رہا ہے بلکہ انسان بغیر محبت کے زندگی نہیں گزار سکتا۔ جو کام کرتا ہے، محبت و اشتیاق اس کام کی محرک ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ محبت کس محبوب سے مربوط ہونی چاہیے، اس میں عموما اشتباہ کرتا ہے۔ جو انسان انحرافات کا شکار رہیں، ان میں یہ محبت، زر

،زن اور زمین ، کی لذتوں تک محدود رہتی ہے۔ کیونکہ ایسے افراد حیوانات کی وادی میں گم ہیں انسان کا دل تو خدا کی محبت سے خالی نہیں رہ سکتا اور خدا کی محبت کے ساتھ غیر خدا کی محبت مومن کے دل میں جمع نہیں ہو سکتی: ماجعل الله لرجل من قلبين فی جو فه ([2]) یعنی: "اللہ تعالی نے انسان کے شکم میں دو دل نہیں ٹھہرائے۔" امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "انسان کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک خداوند اس کی نگاہ میں اس کی اولاد اور مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔([3]) قرآن مجید میں خداوند کریم نے جب ان مومنین کا ذکر کیا ہے جو اللہ کے دین پر ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو ان کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ: يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ([4]) یعنی: ''وہ محبوب خدا اور اس سے محبت کرنے والے ہوں گے۔''

اس آیت میں خداوند فرماتا ہے ''اے ایمان والو تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پلٹ جائے گا تو عنقریب خدا ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جو اس کی محبوب اور اس سے محبت کرنے والی، مومنین کے سامنے خاکسار اور کفار کے سامنے سخت پیکار، راہ خدا میں جہاد کرنے والی اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے پرواہ ہو گی۔ یہ فضل خدا کا ہے۔ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور صاحب وسعت و علیم اور دانا بھی ہے۔''

اگرچہ روایات میں اس آیت کا مصداق حضرت علیؑ کو بیان کیا گیا ہے لیکن شان نزول کسی حکم کو مقید و محدود کرنے کا موجب نہیں بن سکتی۔ یہ آیت جہاں عمومی طور پر مومنین کو محبت خدا کی طرف ترغیب دلاتی ہے، وہیں مومنین کو ایک اسوہ اور نمونہ عمل کی بھی نشان دہی کرتی ہے۔ حضرت علیؑ کی ذات گرامی جو اپنے مقام پر ایک امت کی حیثیت رکھتی ہے اور جس نے ''خیبر'' میں زبان رسول خداؐ سے محب و محبوب ہونے کی سند حاصل کی ہے۔ جس کا کردار یہ رہا ہے کہ صاحبان ایمان کے سامنے انتہائی خاکسار اور کفار کے مقابلہ میں شیر پروردگار رہے۔ یہی اس قابل ہیں کہ انہیں مظہر محبت الہی سمجھتے ہوئے اپنا ولی اور سرپرست بنایا جائے۔

اس آیہ مجیدہ میں ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ خدا نے پہلے ''يُّحِبُّهُمْ'' فرما کر بتایا ہے کہ آغاز محبت اللہ کی طرف سے ہے۔ یہی الہی محبت، انسان کو مجذوب کرتی ہے تو ایک موحد شخص خدا سے محبت و عشق کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ '' مظہر رحمانیت '' بن جاتا ہے۔ اللہ کے بندوں سے محبت انہیں رات کو بھی سونے نہیں دیتی۔ کبھی اپنے دوش مبارک پر کھانا اٹھا کر لوگوں کے گھروں میں پہنچاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی اپنے کم سن بچوں سمیت غریبوں مسکینوں کو ایسے خلوص بھرے انداز میں اطعام کرتے ہیں کہ قرآن بھی تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا[5] یعنی: "یہ اللہ کی "محبت" میں مسکین یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں [اور یہ کہتے ہیں کہ] ہم تمہیں محض خدا کی خوشنودی کے لئے کھلا رہے ہیں؛ ہم تم سے کسی اجر و پاداش اور شکر گزاری کی توقع نہیں رکھتے۔" پس محبت کی وجہ سے انسان دین و اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے جبکہ "محبت" سے خالی شخص کو اللہ نے بے دین کہا ہے: اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ یعنی: "آیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھتکارتا ہے۔" یعنی یتیموں سے پیار نہیں کرتا اور ان کی پرواتک نہیں کرتا۔

۲۔امن و سکون

انسان کے افعال و اعمال کا دار و مدار اُس کے باطنی محرکات پر ہوتا ہے۔اس کی روحانی کیفیت جتنی بہتر ہو گی اتنا ہی موثر انداز میں اپنے افعال انجام دے گا۔چند چیزیں جو روح انسان کے لیے ضروری ہیں ان میں خواہش (طلب)، امید، اور اطمینان و سکون ہیں۔ یہ مثلث ایسی چھتری ہے جس کے سہارے انسان اپنے مقاصد عالیہ اور منزل مقصود کی طرف پرواز کرتا ہے اور ان تینوں کا مبدا و منبع یاد خدا ہے۔ یاد خدا کی وجہ سے انسان خواہش بھی رکھتا ہے، اسے امید بھی ہوتی ہے اور اطمینان و سکون بھی، جب تک روحانی سکون نہ ہو، انسان کوئی کام انجام نہیں دے سکتا بلکہ ماہرین نفسیات کے مطابق اکثر بیماریوں کی جڑ عدم سکون ہے۔ سکون کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہر قسم کی ترقی کا انحصار روحانی سکون پر ہے یہ سکون اور روحانی اطمینان صرف توحید پر ایمان کے سائے میں ہی ممکن ہے۔

خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ[6] یعنی: "یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دلوں کو یاد خدا سے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اطمینان یاد خدا سے ہی حاصل ہوتا ہے۔" مفسرین کی نظر میں "وتطمؤنّ قلوبهم" عطف تفسیری ہے "الذین امنوا" پر یعنی ایمانِ توحید کا لازمہ "اطمینان قلب" ہے اضطراب و پریشانی کا سب سے بڑا سبب مستقبل کا تاریک ہونا ہے یہ بات انسان کی فکر کو ہمیشہ مشغول رکھتی ہے کہ میرا مستقبل کیا ہو گا؟ میری اولاد کا مستقبل کیا ہو گا؟ یہی فکر انسان کو ذہنی مریض بنا کر زمین گیر کر دیتی ہے جب کہ مومن اپنے مستقبل سے نہ فقط مایوس نہیں بلکہ روشن مستقبل پر دل کی گہرائیوں سے پختہ یقین رکھتا ہے اس لیے کہ اس کے رب نے اسے یقین دلایا ہے کہ: اُوْلٰٓئِكَ

هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ[7] ترجمہ: "مومن کا مستقبل یہ ہے کہ جنت الفردوس کی وراثت اس کے نام ہے جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔" نیز خدا نے اپنے خاص بندوں کو اطمینان وسکون کی سند عطا کر دی ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ(8) ترجمہ: "آگاہ ہو جاؤ، اولیائے خدا پر نہ خوف طاری ہوتا ہے نہ وہ محزون و رنجیدہ ہوتے ہیں۔۔۔ان کے لئے زندگانی دنیا اور آخرت دونوں مقامات پر بشارت اور خوش خبری ہے۔"

مومن جب ایمان کے سائے میں جہاد کرتا ہے اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی دکھاتا ہے تو خدا اسے "اطمینان" جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کر دیتا ہے۔ اہل بدر کے مجاہدین کا تذکرہ کرتے ہوئے خداوند فرماتا ہے: "یقیناً اگر تم صبر کروگے (ثابت قدم رہوگے) اور تقوٰی اختیار کروگے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے اور اس امداد کو خدا نے صرف تمہارے لیے بشارت اور "اطمینان قلب" کا سامان قرار دیا ہے۔"(9) 'اطمینان وسکون' ایمان سے بھی اوپر کا درجہ ہے۔ جسے حضرت ابراہیمؑ نے طلب فرمایا۔ ابراہیمؑ نے التجا کی کہ پروردگار مجھے یہ دکھادے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوا کیا تمہارا ایمان نہیں ہے؟ عرض کی ایمان تو ہے لیکن اطمینان چاہتا ہوں: وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (10)

انسانی معاشرہ میں امن وامان کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ حاکم طبقہ بعض دفعہ عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے اسی 'امن وامنیت' کا سہارا لیتا ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ یہ ہر ذی روح کی اولین ضرورت اور انسانی زندگی کا اہم ترین تقاضا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ ناامنی کا حل توحید کے بغیر ممکن نہیں۔ خداوند فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ[11] ترجمہ: "جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا انہیں کے لیے امن وسکون ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔" قرآن کی نگاہ میں تنہا ایمان کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ اس کا ایمان ظلم سے آلودہ نہ ہو۔ اگرچہ یہاں ظلم کی تعبیر میں عمومیت پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (12) یعنی: "شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔" لہٰذا ایسی توحید خالص جو شرک اور دیگر مظالم سے پاک ہوگی انسان کے امن وسکون کا ذریعہ ہے۔

علامہ طباطبائی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: "اس آیت میں امن و ہدایت اس ایمان کے آثار ہیں جو مشروط ہے عدم ظلم کے ساتھ یعنی یہ ظلم اصل ایمان کو باطل کرنے کا باعث نہ بنے۔ سیاق آیات سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہاں ظلم کی ایک خاص قسم مراد ہے۔ایسا ظلم جو ایمان پر اثر انداز نہ ہو۔اگر انسان کا ایمان شرک اور معصیت جیسے ظلم سے پاک ہو گا تو اسے امن وہدایت نصیب ہو گی علاوہ ازیں 'امن' و'ہدایت ' میں بھی عمومیت پائی جاتی ہے یعنی ہر قسم کے گناہوں کے عذاب سے محفوظ و مامون رہتے ہوئے ہدایت یافتہ افراد میں شامل ہو جائے گا۔ "([13])

اسلام ایسا دین ہے جو انسان کے لیے ہر طرح کے امن وامان کا ضامن ہے۔ خدا نے مکہ مکرمہ کو خانہ کعبہ کے وجود مبارک کی وجہ سے انسانوں کے لیے 'امن اور پناہ گاہ' قرار دیا۔یعنی مکہ مکرمہ سکون روح کا مرکز اور اجتماعی امن کا گہوارہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پروردگار سے امن وسکون اور روزی کی فراوانی کے لیے دعا فرمائی جس سے امن وامنیت اور اقتصادی ترقی کے درمیان گہرے تعلق کو سمجھا جا سکتا ہے۔([14]) آج بھی بین الاقومی تاجر کسی ملک میں اس وقت تک سرمایہ کاری نہیں کرتے جب تک وہ ملک انہیں 'امن وسلامتی ' کی ضمانت نہ دے۔ قرآن مجید نے امن واطمینان اور روزی کی کثرت کو ایک ترتیب سے بیان کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ امن واطمینان کے بعد اقتصادی ترقی کے امکانات فراہم ہوتے ہیں۔

البتہ یہ تینوں مادی نعمات اس وقت کامل ہوں گی جب لوگ توحید پر ایمان جیسی معنوی نعمت سے بہرہ مند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تین نعمتوں کے ذکر کے بعد فرمایا: "ان کے پاس خود انہی میں سے رسول آیا تاکہ انہیں توحید کی نعمت سے سرفراز کرے۔"([15]) دراصل، یہ تمام مادی نعمات اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع ہیں اگر خدا نہ چاہے تو پہاڑوں کو چیر کر محفوظ قسم کے مکانات بنانے کے باوجود منکرین توحید عذاب سے امن حاصل نہیں کر سکتے۔([16]) اس حوالے سے آقائے محسن قرائتی فرماتے ہیں: 'حرم الٰہی ' امن وسلامتی کا گھر ہے اور 'امن واطمینان 'عبادات الٰہی کے لیے بہترین بچھونا ہوتا ہے لیکن بعض باطل پر ایمان رکھنے والے لوگ اس سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ ([17]) پس توحید پر ایمان ایسی نعمت ہے جو انسان اور معاشرے کو امن واطمینان عطا کرتی ہے۔ جن کی ایک واضح مثال حضرت یوسف صدیقؑ کا مصر جیسے ملک کو امن وامنیت میں بدل دینا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے برادران اور والدین سے فرمایا کہ : وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَاِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ "([18]) یعنی: "آپ ان شاء اللہ مصر میں بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ داخل ہو جائیں۔"

۳۔مشکلات میں صبر واستقامت

قرآن مجید میں مومن کی ایک نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مشکلات میں صبر کرنے والے ہیں۔ پھر صبر کے

نتیجہ میں خدا انہیں ہر قسم کے خوف و ہراس اور غم والم سے محفوظ کر دیتا ہے :"اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ" ([19]) اس قسم کی آیات صبر واستقامت کو ایمان کا لازمہ قرار دیتی ہیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں۔"صبر و ایمان کا رابطہ سر و بدن جیسا ہے۔ جو صبر نہیں رکھتا وہ ایمان سے بھی خالی ہے۔" ([20]) یعنی جس طرح بغیر سر کے بدن نابود ہو جاتا ہے۔اس طرح بغیر صبر کے ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ مشکلات کا مقابلہ کرنا توحید کے علمبر دار شخص کا خاصہ ہے۔استقامت کا مقصد توحید کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے چاہے وہ اظہار کا حکم دیں یا سکوت کا، جہاد کا حکم دیں یا صلح کا۔ اگر توحید کے تقاضے انسانی زندگی کی بنیاد بن جائیں تو پھر کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔خداوند فرماتا ہے۔ اگر انسان نظام توحید کو قبول کرنے کے نتیجہ میں پیش آمدہ مشکلات و مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرے تو میں فرشتوں کے ذریعے بھی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہوں :اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ([21]) ترجمہ : "بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب (مدیر ومدبر) ہے اور اس پر ڈٹے رہے ان پر ملائکہ پیغام لے کر نازل ہوتے ہیں۔" کہ ڈرو نہیں اور رنجیدہ بھی نہ ہوں اور اس جنت سے مسرور ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے ہم زندگی دنیا میں بھی تمہارے ساتھی تھے اور اخرت میں بھی تمہارے ساتھی ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں صبر کرنے والوں کو روشن مستقبل کی نوید سنائی جارہی ہے جو انسان کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ یہ سب نعمات "توحید ربوبیت "پر ایمان کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ وہ مومن جو تمام حرکات وافعال کا مبدائے حقیقی اللہ تعالیٰ کو مانتا ہو۔ پھر ایسے رب سے محبت بھی کرتا ہو تو لازمی امر ہے کہ اپنی ہر مصیبت کو اپنے محبوب کی طرف سے فضل وسعادت سمجھتے ہوئے برداشت کرے گا۔ کیونکہ خدائے رحمان و رحیم بندے کے لیے سوائے خیر وخوبی اور سعادت وخوش بختی کے کچھ نہیں چاہتا۔جب انسان مصائب ومشکلات کے دوران صبر سے کام لیتا ہے تو صلواۃ اور رحمت الٰہیہ کا حقدار بن جاتا ہے خداوند فرماتا ہے: وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ ([22]) ترجمہ : "اے رسول خداؐ آپ ان صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں جو مصیبت پڑنے پر کہتے ہیں: ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں؛ کہ ان کے لیے پروردگار کی طرف سے صلوات اور رحمت ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔"پس توحید پر ایمان انسان کو صبر واستقامت کا درس دیتا ہے جسے مومن اپنی زندگی میں عملی جامعہ پہناتا ہے۔

۴۔ حسن عاقبت

انسان کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ 'روشن مستقبل' کا خواہاں ہے اس کی ہر ممکنہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا انجام بخیر ہو۔ قرآن مجید نے چند آیات میں ارتداد (اسلام سے کفر کی طرف پلٹ جانے) کو بیان کیا ہے۔ اسلامی فقہ میں بھی ارتداد کی بحث موجود ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شیطان ہر لحہ کوشش میں رہتا ہے کہ مومن کو گمراہی کی وادی میں ڈال دے لیکن جن کا ایمان پختہ ہوتا ہے وہ شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ ارتداد کے شدید خطرہ کے پیش نظر 'راسخون فی العلم' بھی ایمان و عقیدہ پر ثابت قدم رہنے کی دعا کرتے ہیں: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً[23]

ترجمہ: "اے پروردگار۔ جب تو نے ہمیں ہدایت دے دی ہے تو اب ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا ہونے پائے اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔"

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومن ہمیشہ اللہ کی رحمت کا طلب گار رہتا ہے۔ کیونکہ ایمان لانے سے زیادہ مہم اس ایمان پر قائم رہنا ہے اور اگر خدا کی مدد شامل حال نہ ہو تو لغزش کا خطرہ موجود ہے۔ حسن عاقبت کی اہمیت کا اندازہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت یعقوبؑ کی اس وصیت سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی اولاد کو آخری وقت میں بیان فرمائی: وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[24] یعنی: "اور اس بات کی ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ اللہ نے تمہارے لیے دین کو منتخب کیا ہے اب مرتے دم تک اس کے سامنے سر تسلیم خم رہیے گا۔" یعنی اسی دین پر باقی رہیے گا۔

اس آیہ کریمہ سے یہ نکتہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ عقیدہ و ایمان کتنا قیمتی سرمایہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی اپنی اولاد کے متعلق فکر و مند رہنا چاہیے اور اپنی وصیت میں فقط مادی امور پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ ([25]) تاریخ میں ایسے افراد کا ذکر ہے جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گئے۔ ان مرتدین میں واضح مثال مساجد اربعہ ملعونہ کی ایک مسجد کے بانی "شَبَث بن رِبعی" کی ہے کہ حضرت رسولخداؐ کے زمانہ میں مسلمان ہوا، حضرتؐ کے بعد مرتد ہو گیا اور سجاح (نبوت کا دعوی کرنے والی عورت) کا موذن رہا۔ پھر توبہ کر لی اور حضرت علیؑ کے ساتھ شامل رہا۔ جنگ صفین میں مرتد ہو کر خوارج کے لشکر کا سپہ سالار بنا اور جنگ نہروان علیؑ کے خلاف لڑی۔ پھر توبہ کر لی اور امام حسنؑ و امام حسینؑ کے ساتھیوں میں شامل ہو گیا یہاں تک کہ امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دینے والوں میں شریک تھا لیکن پھر حضرت مسلم بن عقیلؑ کے ساتھ بے وفائی کی اور کربلا میں

لشکر یزیدؑ میں شامل ہو کر قتل حسینؑ کے گناہ کا مرتکب ہوا۔ پھر امام حسینؑ کے قتل کے شکرانہ میں کوفہ میں مسجد تعمیر کروائی۔ پھر خون حسینؑ کا قصاص لینے کی غرض سے امیر مختار ثقفی کی فوج میں شامل ہوا۔ آخر کار اسی مختار ثقفی کو قتل کرنے والوں کے ساتھ ملحق ہو گیا۔۔۔([26])

خداوند متعال نے اہل ایمان کو حسن عاقبت (خاتمہ بالخیر) کی تنبیہ کی ہے اور اس کا نسخہ بھی بتایا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ([27]) ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جو ڈرنے کا حق ہے اور خبردار مرتے دم تک مسلمان رہنا۔" اس آیہ مجیدہ میں خداوند کریم نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ ایمان لانا کافی نہیں ہے بلکہ ایمان پر باقی رہنا ضروری ہے، وہیں ایمان پر باقی رہنے کا بہترین ذریعہ "تقوائے الٰہی" کو قرار دیا ہے یعنی توحید عملی بہترین وسیلہ ہے خاتمہ بالخیر کا کیونکہ خوف خدا اور ہر عمل میں اللہ کی مدد کا طلب گار رہنا ایسا مضبوط سہارا ہے جس کے ٹوٹنے کا خطرہ نہیں) رسول خداؐ کی معروف دعا ہے جو ہمیشہ پڑھا کرتے تھے: الٰهی لا تکلنی الیٰ نفسی طرفة عین ابداً[28] ترجمہ: "اے میرے معبود پلک جھپکنے کی مدت تک بھی مجھے میرے حال پر نہ چھوڑنا۔" البتہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ جو پختہ ایمان کا مالک ہو گا، اسے دنیا و آخرت میں اپنی غیبی مدد کے ذریعے اس عقیدہ پر ثابت رکھے گا۔

۵۔ شرح صدر (وسعت قلبی)

سینہ کشادگی، وسعت قلبی یا اعلیٰ ظرفی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ یہ صرف اس شخص کو نصیب ہوتی ہے جو توحید کے سائے میں زندگی گزارنے کا عزم و ارادہ رکھتا ہو۔ اس صفت کے مقابلے میں تنگ دلی تعصب اور پست ذہنیت ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے علاوہ کسی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ درحقیقت ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ جس کی بنا پر وہ صرف اپنی بات کو حق سمجھتا ہے کسی کی بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتا۔ توحید پرست شخص صرف خدا ہی کو ہدایت کا سرچشمہ سمجھتا ہے لہٰذا سینے کی کشادگی اور فراخ دلی کو بھی اسی مبداء حقیقی سے طلب کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کو جب اتنی بڑی ذمہ داری سونپی گئی کہ فرعون جیسے طاغوت کو دعوت توحید دیں تو اس رسول الٰہی نے اپنے خالق و مالک سے شرح صدر اور سینہ کی کشادگی کی مدد طلب کی: قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ[29] یعنی: "اے میرے پروردگار میرے سینے کو کشادہ کر دے، میرے کام کو آسان کر دے۔"

ایک مقام پر خداوند فرماتا ہے کہ میں جسے ہدایت پر گامزن رکھنا چاہتا ہوں اُسے کشادہ دل بنا دیتا ہوں: فَمَنْ یُّرِدِ

اللہُ اَنۡ یَّھۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ (30) ترجمہ: "پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار گزار بنا دیتا ہے کہ جیسے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو۔" حضرت رسول خداؐ سے پوچھا گیا۔ شرح صدر (سینہ کی کشادگی) کیا ہے؟ فرمایا: نور یقذف اللہ فی قلب من یشاء فیشرح لہ صدرہ وینفسخ ترجمہ: "ایک نور ہے خدا جس شخص کے دل میں چاہتا ہے اسے روشن کر دیتا ہے۔ جس کے باعث اس کی روح کشادہ اور فراخ ہو جاتی ہے۔" پھر پوچھا گیا کہ اس کی کوئی نشانی و علامت ہے؟ فرمایا: نعم الا نابۃ الی دار الخلود والتجافی عن دار الغرورولا ستعداد للموت قبل نزول الموت (31) یعنی: "ہاں اس کی علامت یہ ہے کہ جہان ابدی کی طرف توجہ، دنیا کے فریب سے دور رہنا اور موت آنے سے پہلے موت کے لیے آمادہ رہنا۔"

توحید پر ایمان ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ بے جا تعصب اور خود پسندی کی بنا پر کسی کی تردید نہ کریں۔ دوسرں کے خیالات و نظریات نیز ان کی زحمات کا بھی احترام کریں۔ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرں کی آراء و نظریات کو سنیں اور بے دلیل رد نہ کریں۔ اگر ان صفات کو عملی کر دیا جائے تو پھر ایک تنظیم دوسری تنظیم کی معاون، ایک ادارہ دیگر ادارہ جات کا حامی و مددگار اور ایک کارکن دوسرے کارکنان (علماء وغیرہم) کا بہترین سہارا بن جائے گا۔ جس کے نتیجہ میں مکتب توحید کی پورے عالم پر سرفرازی کا خواب جلد شرمندہ تعبیر ہوگا۔

ماثورہ دعاؤں میں سے ایک بہترین دعا یہ ہے: اللھم ارزقنی التجافی عن دار الغرور والانابۃ الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل حلول الفوت[32] اس دعا کے طفیل اللہ پاک سے وسعت اخلاق اور برادران دینی کے درمیان خاطر داری کے ساتھ پیش آنے کی امید رکھنی چاہیے۔

خداوند کریم فرماتا ہے: اَفَمَنۡ شَرَحَ اللہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَوَیۡلٌ لِّلۡقٰسِیَۃِ قُلُوۡبُھُمۡ مِّنۡ ذِکۡرِ اللہِ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (33) یعنی: کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہوا اور جسے اپنے رب کی طرف سے روشنی ملی ہو (سخت دل والوں کی طرح ہو سکتا ہے؟) پس افسوس ہے ان لوگوں کے حال پر جن کے دل ذکر خدا کے لیے سخت ہو جاتے ہیں یہ لوگ کھلم کھلا گمراہی میں ہیں۔" اس آیہ کریمہ کی رو سے تنگ نظر اور یکطرفہ سوچنے والا انسان حق و باطل میں تمیز دینے والے نور سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضرت امام خمینیؒ فرماتے ہیں۔ "اے میرے فرزند۔ تو اگر صاحب حکمت و عرفان نہ بن سکے تو مقامات

عارفین و صالحین کا انکار نہ کرنا۔ ان کی مخالفت کو دینی فریضہ نہ سمجھنا" ۔ چہل حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ " قلب مومن مفتوح (کشادہ) ہے کیونکہ خالص و پاکیزہ فطرت سے خارج نہیں ہوا۔ لہٰذا جیسے ہی حقائق ایمان اور معارف حقہ کو اس کے سامنے پیش کیا جائے تو فوراً قبول کر لیتا ہے جب کہ قلب منافق، جاہلانہ تعصّبات، تنگ نظری، حب نفس۔ مقام و شہرت سے محبت جیسے اخلاقِ رذیلہ کی بناپر فطرت انسانی سے خارج ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں حق بات کو ہر گز قبول نہیں کرتا۔ اس کے دل کی مثال اس کاغذ جیسی ہے جو مکمل طور پر سیاہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا نیا نقش قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ نیز فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا کی محبت اور اس کی تعمیر وترقی میں مشغول ہو جائے، اس کا دل حق سے منحرف ہو جائے گا، اگرچہ مبداء و معاد پر اعتقاد ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ ([34]) پس معلوم ہوا کہ توحید پر عقیدہ کو جب تک عملی نہ کیا جائے، دل کی پاکیزگی اور وسعت حاصل نہیں ہو سکتی۔

٦۔ دھوکا اور فریب سے اجتناب

ہر شخص، دھوکا باز اور مکار قسم کے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔ مکر، حیلہ، دھوکا اور فریب کو پسند نہیں کرتا اس کے باوجود کہ سبھی لوگ یہ برداشت نہیں کرتے کہ کوئی انہیں دھوکا دے لیکن پھر بھی کچھ لوگ دوسروں کو دھوکا دینے اور مکارانہ چالوں سے اپنے مفادات حاصل کرنے سے باز نہیں آتے۔ مومن شخص کیونکہ خدا کو تمام امور میں 'مسبّب الاسباب' سمجھتا ہے اور خدا ہی پر توکل کرتا ہے، اسی بناپر اپنی دنیاوی زندگی کو سنوارنے کی خاطر مکر اور فریب وغیرہ سے کام نہیں لیتا۔ مومنین کے مزاج کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے: "کہہ دیجئے کہ ہم تک وہی حالات آتے ہیں جو خدا نے ہمارے حق میں لکھ دیئے ہیں وہی ہمارا مولا ہے اور صاحبان ایمان اُسی پر توکل اور اعتماد رکھتے ہیں۔" ([35])

توحید پر ایمان کی وجہ سے مومن مقام تسلیم و رضا پر فائز ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی کامیابی کو صرف خدا سے چاہتا ہے اور شیطانی حربوں سے پرہیز کرتا ہے جب کہ غیر مومن حیلہ و مکر کا سہارا لیکر اپنے مفادات کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آیات قرآن گواہی دیتی ہیں کہ انبیا کرام علیہم السلام کے مخالفین نے حق کے مقابلہ کے لیے ہر قسم کا دھوکا، فریب، حیلہ اور مکر استعمال کیا۔ فرعون نے عوام کو فریب دینے کے لیے جادو گروں کا سہارا لیا لیکن وہی جادو گر جب حق کا واضح انداز میں مشاہدہ کرتے ہیں تو فرعون کی چال میں نہیں آتے۔ اللہ وحدہ لاشریک کی گواہی دیتے ہوئے اس طاغوت کی مخالفت کرتے ہیں۔ جادو گروں کے ایمان لانے کے بعد فرعون انہیں

ملامت کرتے ہوئے دھوکا باز کہنے لگتا ہے لیکن حضرت موسیٰ اہل توحید کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ[36] ترجمہ: "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین کا مالک اللہ ہے وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے وارث بناتا ہے۔"

حضرت صالح (ع) نے جب اپنی قوم کو صرف اللہ کو معبود ماننے کی دعوت دی تو ان لوگوں نے بھی اللہ کے اس نمائندے کے خلاف چال چلی۔ پہلے تو حضرت صالحؑ کو فریب دے کر قتل کرنے کی سازش کی اور بعد میں ناقہ صالح کو قتل کرکے عذاب الٰہی کے مستحق قرار پائے۔ خدا فرماتا ہے: "پھر انہوں نے اپنی چال چلی اور ہم نے بھی اپنا انتظام کیا کہ انہیں خبر بھی نہ ہو سکی پھر آپ دیکھو کہ ان کی مکاری کا انجام کیا ہوا کہ ہم نے ان رؤساء کو ان کی قوم سمیت بالکل تباہ و برباد کر دیا۔"[37] حضرت نوحؑ کے مخالفین کے متعلق بھی قرآن کہتا ہے: وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا[38] ترجمہ: "اور انہوں نے بہت بڑا مکر کیا۔"

لیکن دوسروں کو دھوکا دینے والے بری طرح غرق ہو کر خود اپنے فریب کا شکار ہوگئے۔ خداوند متعال ایک عمومی قاعدہ بتاتا ہے کہ جو بھی دھوکا اور فریب کا سہارا لے گا، اس کی مکاری کا اثر اسی کے خلاف ہوگا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ[39] یعنی: "اور اس طرح ہم نے قریہ میں بڑے بڑے مجرموں کو موقع دیا ہے کہ وہ مکاری کریں اور ان کی مکاری کا اثر خود ان کے علاوہ کسی پر نہیں ہوتا لیکن انہیں اس کا بھی شعور نہیں۔" مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ حیلہ و مکر توحید کے دشمنوں کا نجس ہتھیار رہا ہے۔ ایک موحد اور قرآن کے سائے میں زندگی بسر کرنے والے شخص کے لیے ناممکن ہے کہ وہ دھوکا باز بنے بلکہ وہ خود کو حق پر سمجھتے ہوئے صرف حق پر بھروسہ کرے گا۔

۷۔ ایثار و قربانی

"ایثار" اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینے کا نام ہے۔ شریعت مقدس میں ایثار و قربانی کرنے کی بڑی تاکید ہے اور اس نیک عمل کا بہت بڑا اجر بیان ہوا ہے۔ اس کے مد مقابل صفت "حرص" ہے۔ دنیا میں ادنی مظالم سے لے کر استعمار اور دیگر ممالک پر تسلط جمانے تک سارے نظام کی بنیاد یہی حرص ہے۔ اسلام نے ایک دستور دیا ہے۔ کہ اگر انسان حرص سے بچ گیا تو وہ ہر مصیبت و بلا سے محفوظ ہو گیا کیونکہ حریص شخص دولت و اقتدار کے نشے میں مست ہو کر تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے جب کہ ایثار و فداکاری کرنے والا فیاض و سخی شخص زندگی کی تمام لذتوں سے بہرہ مند ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جب انسان خدا کی

معرفت حاصل کر لیتا ہے تو اس کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ ہر طرح کا مال و جان خدائے واحد کی جانب سے عطیہ ہے جو انسان کو امانت کے طور پر جائز تصرفات کے لیے دیا گیا ہے۔ شہدائے اسلام کی عظیم قربانیوں سے تاریخ پُر ہے۔

قرآن مجید اہل مدینہ کے ایثار کی مثال پیش کرتا ہے: یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [40] یعنی: "وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ انہیں (مہاجرین کو) دے دیا گیا اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی الجھن نہیں پاتے اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں چاہے انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اور جسے نفس کی حرص سے بچا لیا جائے وہی لوگ کامیاب ہیں۔" اسی طرح حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: "ایثار، ایمان کے عالی ترین مرتبہ کا نام ہے۔" [41] لہٰذا ایک عاشق توحید اپنے ایمان کو عالی درجے تک پہنچانے کی خاطر ایثار کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کرے گا۔

۸۔ طاغوت کا مقابلہ

مبدا حقیقی پر ایمان انسان کو طاغوت اور سرکش طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ و تیار رہنے کا درس دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا ایمان ہے کہ ہر قسم کی طاقت و قوت کا سرچشمہ خدائے واحد ہے: اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعاً [42] ترجمہ: "ساری قوت صرف اللہ کے لیے ہے۔" نیز یہ بھی عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں: لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ [43] ایسی صورت میں خدائے قوی و عزیز کے مقابلے میں اپنی قوت و طاقت کا اظہار کرنے والے ہر شخص کو طاغوت سمجھے گا اور اس کا انکار کرنے کو جزو ایمان سمجھتے ہوئے اس طاغوت کا مقابلہ کرنے کی خاطر خود کو ایک مضبوط سہارے سے متمسک کرے گا۔ قرآن کہتا ہے: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى [44] ترجمہ: "جس نے طاغوت کو ٹھکرایا اور اللہ پر ایمان لایا یقینا اس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط سہارا تھام لیا۔" یہی ایمان و یقین ایک مومن و موحد کو طاغوت شکن بنا دیتا ہے۔ اسلام نے جو جہاد کو واجب قرار دیا ہے، یہ آزادی کو سلب کرنے کا باعث نہیں بلکہ ان لوگوں کے خلاف اعلان جنگ ہے جو انسانی آزادی کو سلب کرنے کے لیے غلط طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ اسلام نے جہاد کو صرف تین مواقع پر جائز قرار دیا ہے:

(۱) بت پرستی کے خاتمہ کے لیے کیونکہ یہ انسانیت کی کھلی توہین ہے۔
(۲) اسلام کے خلاف حملوں کو روکنے کے لیے۔
(۳) تبلیغ مذہب کی مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے تاکہ واضح طور پر حق بیان ہوسکے۔

قوم عاد کا تذکرہ کرتے ہوئے خداوند فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں ذلت آمیز عذاب اس لیے دیا کیونکہ وہ ناحق طاقت استعمال کر رہے تھے: "پھر قوم عاد نے زمین میں ناحق بلندی و برتری اور تکبر سے کام لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم سے بڑھ کر طاقت ور کون ہے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ طاقت ور ہے اس طرح وہ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں تو ہم نے تیز و تند آندھی بھیج کر اسی دنیا میں عذاب کا مزہ چکھایا۔" ([45]) یہ سنت الٰہی ہے کہ جن لوگوں نے حق کا مقابلہ کیا انہیں ایک نہ ایک دن دنیا میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ فرعون و قارون سے لے کر شاہ ایران اور کارٹر تک اس کی زندہ مثال ہیں۔ قرآن مجید میں کتنی ہی آیات ہیں جو مومن کو طاغوت کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دلاتی ہیں: "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ آپ پر نازل شدہ (قرآن) پر ایمان لے آئے ہیں جب کہ اپنے فیصلوں کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں طاغوت کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔۔۔" ([46])

ایک مقام پر فرمایا: "ایمان والے ہمیشہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں جبکہ کافر ہمیشہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں لہٰذا تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو بیشک شیطان کا مکر بہت کمزور ہے۔۔۔" ([47]) ایک آیہ مجیدہ تو خداوند متعال کے دائمی دستور کو اس طرح بیان کرتی ہے: "اور یقینا ہم نے ہر امت میں ایک نمائندہ بھیجا کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔۔۔" ([48]) اس آیہ کریمہ کی رو سے سب سے زیادہ عبادت گزار وہی ہوگا جو طاغوت کا بڑا دشمن ہوگا نیز ایک آیت میں خدا نے طاغوت شکن مجاہدین کو بشارت و خوشخبری سنائی ہے: "جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور ایک اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے، ان کے لیے ہماری طرف سے بشارت ہے۔ پس آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے۔" ([49])

ان آیات کے علاوہ بہت سی آیات ہیں جو طاغوت دشمنی کو مومن کا فریضہ قرار دیتی ہیں۔ لہٰذا جو موحد ہوگا، وہ قرآنی اصولوں کے مطابق طاغوت کا مقابلہ کرنے سے کبھی نہیں گھبرائے گا۔

*****

حوالہ جات

1۔بقرہ آیت 156

2 ۔اصول کافی ج2 ص253

3۔بحارالانوار ج70 ص24

4۔مائدہ آیت 54

5 ۔الانسان: 9۔

6 ۔الرعد: 28۔

7 ۔ مومنون 11۔

8۔یونس آیت 4-62۔

9۔آل عمران آیت 125,126

10۔بقرہ آیت 260

11 ۔الانعام: 82۔

12۔لقمان آیت 13

13۔ تفسیر المیزن ج7 ص200

14۔بقرہ آیت 126

15۔ تفسیر نمونہ ج11 ص235

16۔ حجر آیت 82

17۔ تفسیر نور ج12 ص192

18۔یوسف آیت 99

19۔احقاف آیت 13

20۔اصول کافی ج3 ص142

21۔فصلت آیت 30

22۔بقرہ آیت 155,157

23۔آل عمران آیت 8

24 ۔البقرہ: 123۔

25۔ تفسیر نور ج1 ص208

26۔ قاموس الرجال ج5 ص388

27۔بقرہ آیت 256

28 ۔ قطب الدین الراوندی، الدعوات، قم، مدرسۃ الإمام المہدی (ع)، 1407، ص232۔

29 ۔طہ، 25۔

30۔انعام آیت 125

31۔ تفسیر نمونہ ج5 ص436

32 ۔السید ابن طاووس ،إقبال الأعمال، جلد: 1، قم، مکتب الإعلام الإسلامی، رجب 1414، ص : 402۔

33۔زمر آیت 22

34۔ چہل حدیث ص447

35۔توبہ آیت 51

36۔اعراف آیت123,128

37۔ نمل آیت50,51

38۔نوح آیت22

39۔انعام آیت123

40۔حشر آیت9

41۔ میزان الحکمہ ج1 ص2

42۔بقرہ آیت 165

43۔ کہف آیت39

44۔بقرہ آیت256

45۔ حم فصلت آیت15,16

46۔نساء آیت60

47۔نساء آیت76

48۔ نحل آیت36

49۔زمر 17

امامت وخلافت، علم کلام کا ایک اہم باب

Imamat and Caliphate, an Important Chapter of Theology

حجۃ الاسلام محمد اصغر عسکری

بہت سے افراد جو اعتقادی مسائل میں باریک بینی اور گہرائی سے کام نہیں لیتے، وہ خیال کرتے ہیں کہ شیعہ اور سنی کے درمیان امامت کے بارے میں صرف یہ اختلاف ہے کہ شیعہ معتقد ہیں کہ رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ایسا نہیں بلکہ لوگوں نے اپنی مرضی سے اپنے لیے خلیفہ کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اگر مسئلہ امامت کو گہرائی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بحث اور اختلاف کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ خلیفہ کون بنا اور کس کو ہونا چاہیے تھا بلکہ بحث یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ آیا امامت ایک دینی مقام ومنصب ہے یا ایک دنیاوی سلطنت ہے اور اجتماعی عوامل کے تابع ہے؟

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خود رسول خداؐ بھی اپنے خلیفہ کے انتخاب میں مستقل نہیں ہیں بلکہ اس سلسلے میں بھی امر خدا کے تابع ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کی حکمت اور فلسفہ ختم نبوت کا نصب امام کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے شیعوں کے ہاں امامت کو ایک اعتقادی مسئلہ کے طور پر قبول کیا گیا ہے اور اصول دین میں شمار کیا گیا ہے نہ کہ ایک فقہی حکم سمجھا گیا ہے اور اسی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شیعوں نے امام میں عصمت، علم لدنی اور خدا کے انتخاب کو کیوں لازم قرار دیا ہے۔ شیعوں کے نزدیک جتنی اہمیت مسئلہ امامت کی ہے۔ اتنی کسی دوسرے اسلامی فرقہ کے ہاں نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ اور دوسرے اسلامی مکاتب فکر کے نزدیک امامت کے مفہوم میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ شیعہ کے ہاں امامت کو ایک اساسی اور بنیادی مسئلہ جانا جاتا ہے لیکن اہل سنت کے نزدیک امامت ایک فرعی اور فقہی حکم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

امامت کا مفہوم

اسلامی اور قرآنی اصطلاح میں امام کو آئیڈیالوجی نظام اور سیاسی نظام کے محور و مرکز کے عنوان سے جانا جاتا ہے اور امامت کو نبوت اور الٰہی خلافت کا استمرار سمجھا گیا ہے۔ نظام امامت میں اولویت (برتری) اور تقدم کا معیار وراثت اور قومی و حزبی وابستگی نہیں ہے۔ اور اسی طرح خلافت کے عالی مقام کو حاصل کرنے کے لیے رشتہ داری، نسلی برابری اور سیاسی وابستگی معیار نہیں ہے بلکہ معیار اللہ کا منتخب شدہ اور امر خدا سے ہدایت یافتہ ہونا

ملکوت الٰہی کا مشاہدہ اور انسانی کمال کا ممکنہ حد تک عروج اور بلندی ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ خلفاء الٰہی اگر ایک لحظہ کے لیے بھی خطا اور لغزش سے دو چار ہو جائیں تو اس منصب سے محروم ہو جائیں گے اور لاینال عھدی الظالمین) ([1]) کے مصداق قرار پائیں گے۔

لہٰذا نظام امامت میں انتخاب کا معیار انفرادی امور نہیں ہیں۔ معاہدوں سے امامت طے نہیں ہوتی بلکہ امامت میں معیار، معرفت خدا، تقوی اور پرہیز گاری اور معصوم عن الخطاء ہونا ہے۔ لہٰذا جو ان معیارات پر پورا نہیں اترتا وہ خود بخود منعزل ہے۔ اسے عزل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان معیارات پر پورا نہ اترنے والا اگر اپنے آپ کو اُمت کا امام کہلائے تو اسلام کی رو سے وہ طاغوت اور خدا کا دشمن ہے اور اسی عنوان سے اس سے سلوک اختیار کیا جائے گا۔ اسی لیے قرآن مجید نے امام کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ۱: ایک امام نور ہے۔ ۲: دوسرا امام نار ہے۔ جس طرح قرآن نے امام نور کی اطاعت کو واجب جانا ہے اور اس کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیا ہے ویسے ہی قرآن نے امام نار کی مخالفت کو بھی لازم اور واجب قرار دیا ہے کیونکہ آئمہ نور خدا کی صفات کے مظہر ہیں اور آئمہ نار شیطانی اور دین مخالف اقدار کے پاسدار ہیں۔ امام کے نور سے معاشرے میں علم، تقویٰ، اخلاق، عدالت، امن، سلامتی، ایثار، آزادی، شرافت، اور انسانی کرامت جیسے مفہوم زندہ ہوتے ہیں جبکہ امام نار سے جہالت، تعصب، نسل پرستی، ظلم، فسق وفجور، غلامی اور ذلت و رسوائی حاکم ہوتی ہے۔ امامت کے اس مفہوم کو قرآن کی بہت سی آیات نے واضح کیا ہے۔ نمونہ کے لیے چند آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ: قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ترجمہ: "جب ابراہیم کے رب نے ابراہیم کو آزمایا اور مختلف امتحانات اور آزمائشوں سے گزارا اور حضرت ابراہیم ان تمام امتحانوں پر پورا اترے اور کامیاب ہوگئے تو خطاب ہوا کہ ہم نے آپ کو لوگوں کا امام بنایا ہے۔ حضرت ابراہیم نے جب امامت و رہبری کی بشارت سنی اور خدا کی رحمت ولطف کو دیکھا تو خدا کی بارگاہ میں التجا کی: خدایا "ومن ذرّیتی" میری نسل میں بھی کسی کو یہ مقام مل سکتا ہے؟ تو خطاب ہوا: لاینال عہدی الظالمین کہ یہ عہدہ اور منصب ایک مخصوص منصب ہے اور کبھی بھی ظالمین کو نہیں مل سکتا۔

اس آیت کریمہ پر اگر غور کریں تو چند نتائج سامنے آتے ہیں:

۱:۔ امت کی امامت ور ہبری خدائی منصب ہے۔ اور ایسے انسانوں کے لیے ہے جو معنوی اور روحانی مراحل طے کر چکے ہوں اور مختلف آزمائشوں اور امتحانات سے کامیابی کیساتھ گزر چکے ہوں۔

۲:۔ ظالمین سے مراد صرف وہ نہیں کہ جو بالفعل گناہ و شرک کے مرتکب ہوئے ہوں کیونکہ حضرت ابراہیم خلیل خداؑ کبھی ایسے لوگوں کے لیے امامت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ پس معلوم ہوا کہ ظالمین سے مراد وہ افراد بھی ہیں جن کی زندگی کا ایک لمحہ بھی شرک میں گذرا ہو۔ لہٰذا یہ منصب امامت صرف ان کے لیے ہے جو ہر قسم کی خطاء ونسیان سے معصوم ہوں۔

۳:۔ امامت اس کو مل سکتی ہے جو پہلے سے اس کی صلاحیت کو کسب کر چکا ہو نہ یہ کہ منصب کو دیکھ کر اپنے آپ کو اچھا بنانے کی کوشش کرے۔ البتہ ہر تحقیق کرنے والے پر واضح ہے کہ خلافت، امامت کی حقیقت سے جدا ہے۔ چاہے لغوی معنیٰ دیکھیں یا شرعی معنیٰ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ خلافت اس لیے استعمال ہوا ہے کہ خلافت صرف امامت ہی کے شایان شان ہے کیونکہ خلافت رسالت کے کام کو آگے بڑھانے اور رسول کے بعد ان امور کو سنبھالنے کا نام ہے اور وہ کام احکام الہیٰ کو بیان کرنا شریعت کی حفاظت کرنا اور معاشرتی زندگی کو منظّم کرنا ہے بہر حال خلافت امامت کی حیثیتوں میں سے ایک حیثیت ہے اور امامت کا وہ مفہوم جو قرآن مجید اور احادیث نبوی میں آیا ہے، خلافت کے مفہوم سے زیادہ وسیع ہے۔

پس امامت عوام پر خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی سربراہی ہے اور یہ حکومت کے ان عہدوں سے مختلف ہے جو زور اور طاقت کو بھی امام بننے کا معتبر ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خلافت ایک فاسق اور ظالم شخص کی بھی ہو سکتی ہے اور امام فسق وفجور کی وجہ سے معزول کیے جانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ (2)

امامت کی ضرورت

امامت کو قرآن واحادیث آئمہ اطہار کی نظر میں دیکھنے سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ امام کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ ختم نبوت کے بعد یہ سلسلہ امامت کیونکر ضروری ہے؟ اور دین جب مکمل ہو چکا تھا تو آئمہ کی ضرورت کیا تھی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر صاحب فہم وفکر کے ذہن میں اٹھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم انبیاء کرامؑ کی بعثت اور ان کی ضرورت کو سمجھ لیں تو امامت کی ضرورت کو سمجھنا آسان ہو جائے گا کیوں کہ جن ادلہ کے تحت ہم انبیاء کی بعثت اور ضرورت کو ثابت کرتے ہیں، انہی ادلہ سے آئمہؑ کی ضرورت بھی ثابت ہوتی ہے۔ اور ہم نبوت کی بحث میں ثابت کرتے ہیں کہ انسان کی عقل اس کی ہدایت کے لیے ناکافی ہے بلکہ اس خطاؤں او

رلغزشوں کے مجموعہ اور خواہشات نفسانی میں گھرے ہوئے انسان کو ایک الٰہی نمائندے کی ضرورت ہے جو اس کو جگہ جگہ صراط مستقیم کی نشان دہی کرتا رہے اور اپنے عمل سے اس راستے پر چل کے دکھائے۔

انبیاء کی بعثت میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد تب ہی پورا ہو سکتا ہے جب خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے اس انسان کی راہنمائی ہو ورنہ تخلیق انسان کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اور خدا کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انبیاء کو بھیجے جو انسان کو دنیا و آخرت کی سعادتوں کا راستہ دکھائیں اور ان کی تربیت کریں اور اسی طرح اگر اجتماعی حالات اس بات کا تقاضا کر رہے ہوں کہ وہ دین کے اجتماعی قوانین کا نفاذ کریں تو انبیاء اپنی اس ذمہ داری کو بھی پورا کریں اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ دین اسلام کے بعد کوئی اور دین نہیں آئے گا اور یہ احکام قیامت تک باقی رہیں گے اور چونکہ تمام احکامات کو قرآن کے ظہور سے نہیں سمجھا جا سکتا مثلاً تعداد رکعات نماز۔ نماز کی کیفیت اور کئی دوسرے واجبات اور مستحبات، لہٰذا رسول پاکؐ کی ضرورت تھی جو ان احکام کو بیان کریں اور ان کی تشریح کریں۔

ان تمام نکات پر اگر غور کریں تو بڑی آسانی سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ دین مبین اسلام تب ایک مکمل دین اور تمام دنیا کے انسانوں کے لیے تمام مسائل کا جواب دہندہ ہو سکتا ہے کہ جب رسول خداؐ کے بعد ان کا کوئی جانشین ہو جو اُن کی ذمہ داری پوری کرے اور وہ جانشین ایسا ہو کہ جس کے پاس خداداد علم ہو، جو معصوم ہو یعنی ایسا جانشین ہو جو رسول خداؐ کے تربیتی کردار کی عملی تصویر ہو۔ لہٰذا ختم نبوت تب خدا کی حکمت کے مطابق ہو سکتی ہے جب رسول خداؐ کے بعد امام معصومؑ کو نصب کیا جائے اور وہ ایسا امام ہو جو رسول اللہؐ کی رسالت و نبوت کے علاوہ رسول کی تمام صفات و کمالات کا حامل ہو لہٰذا مسلم ہے کہ کسی صورت میں بھی اکیلا قرآن کافی نہیں ہے کیوں کہ اگر اکیلا قرآن کافی ہوتا تو آئین نامہ بغیر حاکم کے اور کتاب طبِ بغیر طبیب کے کافی ہوتی مگر دنیا کا کوئی بھی سلیم العقل انسان اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے مولائے کائنات نے فرمایا: لا بدّ للناس من امیر برّا کان او فاجرا [3] ترجمہ: "لوگوں کے لیے ایک حاکم کا ہونا ضروری ہے؛ خواہ وہ نیک ہو یا فاسق و فاجر ہو۔"

لہٰذا امام معصوم کی ضرورت اظہر من الشّمس ہے۔ اب اگر امامت کے حوالے سے کوئی ضروری بحث ہے تو وہ صفات امام کی بحث ہے اور یہ بحث کرنا چاہیے کہ امام کے انتخاب کا معیار کیا ہے۔ اور امام حق اور امام باطل کی شناخت کیسے ممکن ہے؟ دینی امور میں بھی امام کا وجود ضروری ہے اور دنیوی امور میں بھی دینی امور یعنی جو نبوت کے فرائض ہیں دعوت حق، تبلیغ، احکام شرعیہ کا بیان قرآن مجید کی آیات متشابہہ کی تفسیر وغیرہ یعنی وفات

رسولخداؐ کے بعد مسلمانوں کو ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو ان کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالے۔ ان کی زندگی کو ایام جاہلیت کی رسومات سے متاثر نہ ہونے دے، وہ نفس کے بندے نہ بنیں اور وسواس اور شیطان کے فریب میں مبتلا نہ ہوں۔ لہٰذا ایک ایسے امام کی لازمی ضرورت تھی جو رسول خداؐ کا قائم مقام اور جانشین ہو جو اسلام کی ان تمام ضروریات کو پورا کرتا رہے جن کو رسول خداؐ اپنی حیات طیبہ میں پورا کرتے تھے اور وہ امام ایسا ہو جو ان اہم اور عظیم امور کی انجام دہی کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہو لہٰذا وہ دینی امور جن کے لیے امام کا وجود ضروری ہے، ان میں سے تین باتیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں:

۱:۔ نبی کی وفات کے بعد ان جدید مسائل کا حل جن کے متعلق نہ قرآن میں کوئی صراحت ہے اور نہ رسولخداؐ کی خصوصی نص ہے۔

۲:۔ صحیح اسلامی عقائد کی نشرواشاعت، اس کی دینی توجیہات اور اسلامی ثقافت کی ترویج وقیام۔

۳:۔ اسلام کے معترضین کو رد کرنا اور اسلامی شریعت کی حفاظت اور مسلمانوں کو کفر الحاد کے انحرافات سے بچانا۔

اسی طرح دنیوی امور میں بھی امام کی ضرورت ثابت ہے کہ معاشرے کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے امام یا سربراہ کی ضرورت فطری ہے۔ قدیم زمانے ہی سے اور اس وقت سے جب انسان غاروں اور جنگلوں میں زندگی بسر کیا کرتا تھا، اس وقت کے انسان کو بھی اس ضرورت کا احساس تھا اور آج کا انسان بھی اپنی ضرورت کا شدت سے احساس کر رہا ہے کیونکہ محض قوانین کا موجود ہونا کافی نہیں ہے بلکہ قوانین کے ساتھ ساتھ ایک حاکم وایسے فرمانروا کی ضرورت ہے جو معاشرتی زندگی کو ان قوانین کے تحت چلائے، جو ہر کام شعور سے کرے اور لاشعوری طور پر بھی کوئی غلطی نہ کرے۔ اسی بات کی طرف ڈاکٹر محمد خلیفہ برکات اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ظاہری عقل اور شعور، لاشعوری امور کی نسبت بہت محدود ہے۔ ([4]) لہٰذا اس بات کی ضمانت امام کے علاوہ کوئی شخص نہیں دے سکتا۔ شرح المواقف کے مصنف شیخ ابو علی کہتے ہیں: " امام کو مقرر کرنے سے ایسے ضرر سے بچا جاسکتا ہے جس کا گمان غالب ہو اور بندوں پر ایسے ضرر سے بچنا اگر ممکن ہو تو اجماع کی رو سے بچنا واجب ہے۔" ([5]) کتاب شرح المقاصد کے مصنف اسی بات کا استدال یوں کرتے ہیں: " جہاد، شرعی حدود اور دیگر اسلامی احکام کا نفاذ ایسے امور ہیں جن کا نظام امام کے بغیر نہیں چل سکتا۔" ([6])

پس معلوم ہوا کہ امام کا وجود دینی اور دنیاوی ہر اعتبار سے ضروری ہے۔ امامت کی ضرورت کو سلسلہ عصمت وامامت کے آٹھویں تاجدار امام رضاؑ نے یوں بیان فرمایا ہے: "امامت پر دین کا دارومدار ہے اور اسی کی وجہ

سے مسلمانوں کا نظام اور انتظام چلتا ہے۔ مومنین کی اس میں دنیوی بہتری ہے اور ان کی عزت بھی اسی کے سبب ہے پھیلتے ہوئے اسلام کی جڑ امامت ہے جس کی شاخیں بہت بلند ہیں۔ امام ہی کے سبب سے نماز ،روزہ، زکوۃ، حج، اور جہاد، کمال تک پہنچتے ہیں۔امام ہی کے سبب نیکیوں اور صدقات میں اضافہ ہوتا ہے ۔امام ہی حدود اور احکام جاری کرتا ہے اور امام ہی تفرقے اور گروہ بندیوں کی روک تھام کرتا ہے۔" (7)
امام علی رضاؑ کی اس نورانی حدیث اور اہل سنت کے مذکورہ معروف علما کے اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ امام کا وجود ضروری ہے امام کی حیثیت اس نظام میں ایسے ہے جیسے جسم کے اعضاء میں دل کی حیثیت ہوتی ہے۔ شیعہ اور اہل سنت کے ہاں امامت کے مفہوم میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ گزشتہ بحث کی روشنی میں شیعہ کے ہاں امامت ایک مقدس منصب ہے اور ایسا مقام ہے کہ جس کی بنیادی شرائط میں سے یہ ہے کہ وہ فرد اللہ کا منتخب شدہ ہو، علم غیب رکھنے والا اور معصوم عن الخطا ہو مگر اہل سنت ان صفات میں سے کسی کو بھی خلیفہ کے لیے ضروری نہیں سمجھتے۔

خواجہ نصیر الدین طوسیؒ امامت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: الاْمَامَةُ رياسة عامة لشخص من الاشخاص فی امور الدين والدينا.[8] ترجمہ: "امامت دینی اور دنیاوی امور میں ریاست اور رہبری کا نام ہے۔" یعنی امام صرف مسائل فقہی ہ اور دینی معلومات کا خزانہ نہیں ہوتا بلکہ وقت کا حاکم مطلق ہوتا ہے یعنی خدا اور رسول کے بعد امام معصوم حاکم ہوتا ہے۔ لہٰذا شیعہ کے ہاں امامت اپنے اس وسیع مفہوم کے ساتھ قابل قبول ہے۔ابن خلدون اپنی مشہور کتاب" مقدمہ ابن خلدون "میں لکھتا ہے۔صاحب شریعت کے دین کی حفاظت اور دنیوی سیاست میں نیابت کا نام امامت ہے۔اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امامت کے ایک پہلو کو شامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں اہل سنت کے ہاں امامت وہی خلافت ہے اور خلافت وہی امامت ہے جب کہ ان دونوں مفہوموں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ امامت میں پیشوائی و رہبری شرط ہے اور امام جو کچھ بھی کہتا ہے اس پر عامل بھی ہوتا ہے یعنی قول و فعل دونوں سے رہبری فرماتا ہے جب کہ خلافت میں خلیفہ کوئی عمل انجام دے سکتا ہے اگرچہ اس کا کردار اس کے قول کے منافی ہو۔

امامت قرآن کی نظر میں

لفظ امام قرآن میں بہت سے مقامات پر استعمال ہوا ہے اور تمام موارد میں ایک ہی معنی "مَنْ يُقْتَدٰى به" یعنی: "جس کی پیروی کی جائے" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔قرآن کی بہت ساری آیات نے امامت کے

حوالے سے راہنمائی فرمائی ہے۔اور امامت کے مفہوم کو واضح کیا ہے مگر ہم اختصار کے ساتھ چند آیات کو ذکر کرتے ہیں: وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ترجمہ: "اور ہم نے ان میں سے ایسے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں۔ جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں۔" اس آیہ کریمہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امامت کے عظیم منصب کو پانے کے لیے ذاتی صلاحیت حاصل کرنا ضروری ہے۔اس آیت میں غور کریں تو دو مطلب قابل استفادہ ہیں:

ا۔انسان تب مقام امامت کا حق دار ہے جب مشکلات و حادثات میں صبر سے کام لے اور خدا کی طرف سے امتحانات میں کامیابی سے ہم کنار ہو۔اپنے نفس پر کاملاً مسلط، گناہوں سے بچنے والا ہو، فریضہ کی ادائیگی اور احکام دین پر عمل کرنے میں استقامت دکھائے۔

۲۔جب تک انسان یقین کی منزل کو نہ پائے اور عالم غیب کے حقائق سے مربوط نہ ہو اور دل کی آنکھ سے عالم ہستی کے باطن کا مشاہدہ نہ کرے، مقام امامت و ولایت تک نہیں پہنچ سکتا اور امت کا امام نہیں بن سکتا۔ایک اور آیت میں ارشاد ہوا کہ: وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (۹) ترجمہ: "اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب موہبت فرمائے اور ہم نے ہر ایک کو صالح بنایا اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق راہنمائی کرتے تھے اور ہم نے نیک عمل کی انجام دہی اور قیام نماز اور زکوۃ کی ادائیگی کے لیے ان کی طرف وحی کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔"

امامت روایات آئمہ کے آئینہ میں

ویسے تو امامت کے موضوع پر ہزاروں روایات آئمہؑ سے نقل ہوئی ہیں مگر ہم اختصار سے کام لیتے ہیں اور چند روایات کو بیان کرتے ہیں جن میں امامت کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دین مبین اسلام میں امامت ایک مرکزی نکتہ ہے۔ عام انسان امامت کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا اور یہ ایسا مقام ہے کہ جس کے انتخاب کا حق صرف اور صرف خداوند متعال کو ہے۔ ذیل میں چند روایات کو ذکر کرتے ہیں۔آسمان امامت و ولایت کے آٹھویں تاجدار حضرت امام رضاؑ کو جب مدینہ سے خراسان لایا گیا اور نیشاپور سے جب آپ کا گزر ہوا تو آپ کے چاہنے والے دور دراز کے علاقوں سے سینکڑوں میل پیدل چل کر آپ کے

دیدار کے شوق میں آپ کی خدمت میں آئے اور آپ کی زبان مبارک سے آپ کے جد امجد کی حدیث سننے کی خواہش کی تو اس وقت آپؑ نے فرمایا :

''سمعت عن ابی... میں نے اپنے والد گرامی سے انہوں نے اپنے والد پھر انہوں نے اپنے والد گرامی سے ۔۔۔یہاں تک کہ مولائے کائنات نے رسول اللہؐ سے اور رسول اللہؐ نے حضرت جبرائیل سے سنا ہے کہ خداوند متعال نے فرمایا ہے کہ: کلمة لااله الا الله حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی یعنی: "کلمہ لاالہ الّا اللہ، میرا قلعہ ہے جو میرے قلعے میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے بچ گیا ۔" مورخین نے لکھا ہے کہ یہاں پر امام کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا: بشرطها وشروطها وانا من شروطها[10] یعنی: "توحید اپنی شرطوں کے ساتھ خدا کا قلعہ ہے اور ان شرطوں میں سے ایک شرط میں [علی ابن موسی الرضاؑ] ہوں۔" اس حدیث میں امامؑ نے توحید اور امامت کے رابطے کی نشان دہی کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ امامت کے بغیر توحید نامکمل ہے ۔یعنی توحید اور امامت کا تعلق شرط ومشروط والا ہے جیسے شرط کے فاقد ہونے سے مشروط بھی فاقد ہو جاتا ہے، ویسے ہی امامت کے نہ ہونے سے توحید بھی نہیں ہوگی۔

انہی امام ہشتمؑ سے ایک اور طولانی روایت منقول ہے جو امامت کے مفہوم کو اور واضح تر فرماتی ہے۔ عبد العزیز ابن مسلم روایت کرتا ہے کہ ہم مرو میں امام رضاؑ کے ساتھ تھے یعنی ان کے دور میں موجود تھے اور جمعہ کے دن جامع مسجد میں چند لوگ اکھٹے ہوئے اور امامت کے موضوع پر جو لوگوں کے درمیان موضوع اختلاف تھا، گفتگو کی پھر میں امامؑ کی خدمت میں شرف یاب ہوا۔ امامت کے بارے میں لوگوں کے خیال امامؑ تک منتقل کیے۔ امامؑ مسکرائے اور فرمایا: یا عبد العزیر جهل القوم وخدعو عن آرائیهم ... چونکہ حدیث کافی طولانی ہے، لہٰذا حدیث کے ایک حصے کا ترجمہ پیش خدمت ہے :

''اے عزیر یہ لوگ نادان ہیں انہوں نے اپنی رائے سے دھوکہ کھایا ہے بے شک خداوند متعال نے اس وقت تک اپنے نبی کو نہیں اٹھایا جب تک دین کو مکمل نہیں کر لیا اور قرآن کو نازل نہیں کیا وہ قرآن جس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے حلال حرام ، حدود واحکام اور جس کے لوگ محتاج ہیں سب کچھ قرآن میں موجود ہے فرمایا: ''فَقَالَ عَزَّوَجَلْ: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتْبِ مِنْ شَيْءٍ هَلْ يُرْفَوْنَ قَدْر الْامَامْةِ...''یعنی: کیا وہ لوگ امامت کی قدر و منزلت کو جانتے ہیں تاکہ ان کا کسی کو امت کی شان بالا کے لیے امام منتخب کرنا جائزہ ہو بے شک امامت کی قدر منزلت بلند ہے امامت کی شان اور ایسا عظیم منصب ہے کہ وہ لوگ اپنی عقول ورآراء سے اس کو نہیں سمجھ

سکتے ۔اور نہ اپنے وہم وگمان سے کسی کو امام بنا سکتے ہیں۔ امامت ایسا مقام ہے جس کو ابراہیم نے نبوت اور خلت کے بعد حاصل کیا۔ یہ امامت تیسرا مقام و مرتبہ رکھتی ہے کہ جس کے ذریعے خدا نے ابراہیم کے نام کو بلند کیااور فرمایا : ''انی جاعلک للناس اماماً'' تو حضرت ابراہیم خلیل خدا نے خوشی سے تمنا کی: ''قال من ذرّیتی'' پھر خداوند متعال نے حضرت ابراہیمؑ کی تکریم فرمائی اور ان کی ذریت سے اہل طہارت کو امامت دی اور فرمایا: وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (11)

یہ سلسلہ امامت حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ خداوند متعال نے رسول خداؐ کو اس کا وراث بنایا اور فرمایا :اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ترجمہ: ''اور پھر خدا کے حکم سے اس مقام امامت کو حضرت امیر المومنین کو دیا پھر ان کی برگذیدہ ذریت تک منتقل ہوا۔'' فمن این یختار هو الجهال؟ یعنی: "پس یہ جاہل لوگ کیسے اپنے لیے امام کا انتخاب کرتے ہیں؟" بے شک امامت انبیاء کا مقام ہے اور اوصیا کی میراث ہے۔ امامت اللہ اور رسول خداؐ کی خلافت ہے اور حضرت امیر المومنینؑ کا مقام اور حسنؑ اور حسینؑ کی میراث ہے یقینا امامت زمام دین ،نظام مسلمین اور مومنین کی عزت اور سر بلندی ہے۔ امامت اسلام کی پاک بنیاد اور اس کی بابرکت شاخ کا نام ہے امامت کے وسیلے سے نماز، روزہ حج زکوۃ اور جہاد تمام ہوتے ہیں غنیمت وصدقات کی فراوانی، حدود واحکام کا نفاذ، اور مملکت اسلامیہ کے حدود کی حفاظت ۔نظام امامت ہی کے ذریعے ممکن ہے امام اللہ کے حرام و حلال کو بیان کرنے والا خدا کی حدود کو قائم کرنے والا اور خدا کے دین کا مدافع ہوتا ہے۔ اور امام حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے لوگوں کو راہ خدا کی دعوت دیتا ہے۔ امام سورج کی طرح دنیا میں طلوع کرتا ہے اور افق میں ہوتا ہے تاکہ لوگوں کے ہاتھوں اور آنکھوں سے محفوظ رہے امام ایک درخشاں چاند ، روشن چراغ اور چمکتا ہوا نور ہوتا ہے۔امام رات کی تاریکیوں اور خلوت کے صحراؤں میں اور دریاؤں کے گرداب میں راہنما ستارے کی مانند ہے امام تاریکیوں میں ایسا راہنما ہے کہ جو بھی امام سے جدا ہوا ہلاک ہونا اس کا مقدر ہوگا۔

امام ابر باراں ، روشن آفتاب، سایہ بخش آسمان اور ابلتا ہوا چشمہ ہوتا ہے۔امام مہربان باپ ،دلسوز بھائی اور خدا کے بندوں کی پناہ گاہ ہے خوف کے وقت امام لوگوں پر خدا کا نمائندہ اور اس کی حجت ہے امام نظام دین عزت

مسلمین ، منافقین کے لئے خشم اور کفار کی ہلاکت ہے امام منفرد و یکتا ہے کوئی اس کی برابری نہیں کر سکتا اور کوئی دانش مند اس کا ہمسر نہیں بن سکتا کون ہے جو امام کی حقیقت کا ادراک کر سکے ؟ عقلیں اس کو سمجھنے سے عاجز ہیں۔ امام کی کسی ایک فضیلت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس کے کسی مقام کی تشریح ہو سکتی ہے امام وہ عظیم مقام ہے کہ جس کے سامنے بڑے بڑے خطیب بے زبان دکھائی دیتے ہیں کون امام کی جگہ پر بیٹھ سکتا ہے اور اس کی ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے کیسے ممکن ہے ؟ ہر گز نہیں ہو سکتا۔

امام ایسا روشن ستارہ ہے جو وصف بیان کرنے والوں کی وصف سے بالاتر ہے۔ اس مقام امامت کو بشر کا کیسے انتخاب کر سکتا ہے کہاں عقل اور کہاں مقام امامت رسول اللہ کے خاندان سے باہر کہاں ایسی شخصیت کو ڈھونڈا جاسکتا ہے ؟ اور جو ایسا کہے گا اس نے خود اپنی تکذیب کی ہے اس نے لغو کہا ہے اور اس نے ایسے خطرناک پہاڑ پر قدم رکھا ہے جس کا انجام نیچے گرنا ہے کیا وہ اپنی ناتوان عقل سے امام بننا چاہتے ہیں اور اپنی گمراہ سوچ سے پیشوا کو منتخب کرنا چاہتے ہیں ان کا یہ عمل ان کو سوائے حق سے دور کرنے کے اور کچھ نہیں دے گا: وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ اور شیطان نے اس کے لیے ان کے اعمال کو آراستہ کر دیا تھا اور انہیں راستے سے روک دیا تھا؛ حالانکہ وہ لوگ بہت ہوشیار تھے۔ انہوں نے خدا اور سول خدا کے انتخاب سے دوری اختیار کی اور باطل انتخاب کے پیچھے چلے گئے جب کہ قرآن نے فرمایا ہے : وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ اور کسی مومن مرد اور عورت کو اختیار نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول کسی امر کے بارے میں فیصلہ کر دیں تو وہ بھی اپنے امر کے بارے میں صاحب اختیار بن جائیں اور جو بھی خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گا۔ پس کیسے لوگوں کو امام کے انتخاب کا اختیار ہو سکتا ہے۔ بلکہ اتنا عظیم مقام و منصب جس کو بشر درک نہیں کر سکتا، اس کا انتخاب بھی نہیں کر سکتا اور حق انتخاب صرف خداوند متعال کو ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ سورہ بقرہ آیت 124۔
2۔ شرح المقاصد، ج2، ص872۔
3 ۔ نہج البلاغۃ، تحقیق: شرح: الشیخ محمد عبدہ، جلد: 1، قم، دار الذخائر، ص91۔
4۔ تحلیل الشخصیۃ، ص149۔
5۔ شرح المواقف، ص729۔
6۔ شرح المقاصد، ج2، ص273۔
7۔ اصول کافی، ج1، ص199۔
8 ۔ الشیخ الطوسی، الرسائل العشر، قم، مؤسسۃ النشر الإسلامی التابعۃ لجماعۃ المدرسین، ص103۔
9۔ سورہ انبیا، آیت 73، 72۔
10 ۔ الشیخ الصدوق، عیون إخبار الرضا (ع)، تصحیح و تعلیق وتقدیم: الشیخ حسین الأعلمی، جلد: 1، بیروت، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات، 1984م، ص145۔
11۔ ایضاً۔

فقہ اہل بیتؑ میں بچوں کے حقوق

Childerns' Rights in Ahl al-Bayt Jurisprudence

حجۃ الاسلام سید رمیز الحسن موسوی

مقدمہ

اس سے پہلے کہ ہم اسلامی فقہ میں بچوں کے حقوق کے بارے میں بحث کریں، اس موضوع میں استعمال ہونے والے مفردات کی وضاحت ضروری ہے تاکہ موضوع کی حدود مشخص ہو جائیں۔

حق: جو چیز کسی شخص پر دوسرے کی نسبت واجب ہو یا کسی دوسرے شخص کے ذمہ کسی کی کوئی چیز ہو، اسے اس کا حق کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کسی دوسرے کے بارے میں انسان کی جو ذمہ داریاں ہیں وہ اس کے حقوق کہلاتے ہیں۔ حق کا ایک اور معنیٰ بھی ہے کہ جو چیز مطابق واقع ہو اسے حق کہا جاتا ہے۔ اُردو میں "حق" جن معانی میں مستعمل ہے وہ یہ ہیں: سچ، صدق، دُرست، بجا، ٹھیک۔ ثابت، قائم، فرض، ذمہ داری، جائز، مباح، صلہ، بدلہ، عدل وانصاف اور معاوضہ واُجرت۔ لیکن یہاں فقہی حقوق مراد ہیں کہ جو کسی شخص کی نسبت کسی دوسرے کی گردن پر ثابت ہوتے ہیں۔

فقہ: اُردو میں فقہ سے مراد واقفیت، علم، احکام شریعت کی معلومات یا علم دین اور شریعت اسلامیہ کا علم ہے۔ عربی میں ثلاثی مجرد ابواب میں سے مصدر ہے جس کا معنیٰ جاننا ہے اور شرع کی اصطلاح میں احکام شریعت کے علم کو فقہ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ[1] یعنی: "ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کیوں کوچ نہیں کرتا (اور ایک حصہ باقی نہیں رہتا) تاکہ دین اسلام کے احکام ومعارف سے آشنائی حاصل کرے۔"

بچہ: جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو۔ جسے عربی میں طفل کہا جاتا ہے اور جس پر احکام شریعت لاگو نہ ہوتے ہوں، دوسرے الفاظ میں غیر مکلّف انسانوں میں ایک بچہ بھی ہے۔ اس موضوع میں بچوں کے حقوق سے مراد وہ تمام حقوق ہیں کہ جو اسلامی فقہ میں بچوں کے بارے میں معین کئے گئے ہیں۔ خواہ وہ والدین کے اوپر ہوں یا معاشرے کے اوپر۔ خواہ وہ اپنے بچوں کے حقوق ہوں یا معاشرے میں موجود بچوں کے۔ یعنی یہاں بچہ کا

کلمہ عام ہے یعنی بچہ اپنی اولاد میں سے ہو یا کسی اور کا بچہ ہو۔ اس کے شریعت میں کچھ حقوق ہیں جن کی نشاندہی کرنا مقصود ہے۔

بین الاقوامی قوانین میں، نیز تمام مہذب معاشروں اور اقوام وملل میں بچوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے اور اپنے اپنے قوانین میں نابالغ اور چھوٹی عمر کے افراد کے بارے میں حقوق مشخص کئے گئے ہیں۔ اسی لئے اقوام متحدہ کے بین الاقوامی ادارے نے بھی بچوں کے بارے میں کچھ حقوق مشخص کئے ہیں، یہاں موضوع کی مناسبت سے جن کا مطالعہ بے جا نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن نے بچوں کے جو حقوق مقرر کئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ انسانی حقوق کے بارے میں جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں اُن میں درج بچوں کے تمام حقوق کی مراعات کی جائے اور ہر بچے کو بیان شدہ حقوق دیئے جائیں۔

۲۔ بچے کو خصوصی حمایت حاصل ہونی چاہیے اور اُس کی جسمانی، فکری، اخلاقی، اجتماعی پرورش کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے، وہ اسے فراہم ہونے چاہیں۔

۳۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کا نام اور قومیت مشخص ہو جانی چاہیے۔

۴۔ بچے کو اجتماعی امنیت حاصل ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ ایک سالم ماحول میں پرورش پاسکے۔ لہٰذا بچوں اور ماؤں کو خصوصی حمایت اور محافظت کی ضرورت ہے کہ جو پیدائش سے پہلے اور بعد میں ضروری ہے۔

۵۔ جو بچہ بدنی اور ذہنی لحاظ سے معذور ہے، اسے خصوصی توجہ اور حمایت سے بہرہ مند ہونا چاہیے۔

۶۔ بچے کو مکمل پرورش اور متعادل شخصیت کے لئے محبت اور تفاہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے حتیٰ الامکان اپنے والدین کی سرپرستی میں رہنا چاہیے اور ہر صورت میں ایک محبت بھرے ماحول اور اخلاقی ومادی امنیت کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔

۷۔ چھوٹے بچوں کو سوائے استثنائی مواقع کے ماں سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔

۸۔ معاشرے اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بے گھر اور بے سہارا بچوں کو خصوصی توجہ دے اور اپنی مالی واخلاقی حمایت سے بہرہ مند کرے۔

۹۔ بچوں کو کم از کم پرائمری تک مفت اور لازمی تعلیم دی جائے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لئے انسانی حقوق سے متعلق لکھی گئی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

۱۰۔ہر قسم کی غفلت، ظلم و ستم، شقاوت اور جرائم کے سلسلے میں بچوں کی حمایت کی جائے۔ہر قسم کے نسلی، مذہبی اور قومی تعصّبات کے سلسلے میں بچوں کی حمایت کی جائے اور اُنہیں تحفظ دیا جائے۔([2])

یہ تھا بین الاقوامی حقوق میں بچوں کے حقوق کا خلاصہ کہ جس میں کوشش کی گئی ہے کہ ہر قوم وملت کے بچوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور اُنہیں کسی قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھا جائے لیکن دین اسلام نے انسانی حقوق کے کمیشن کی ان سفارشات سے چودہ سو سال پہلے بچوں کے انہی حقوق کا دفاع کیا ہے اور ان سے بھی بڑھ کر بچوں کے حقوق معین کئے ہیں جن کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

اسلام میں بچوں کے حقوق

پیغمبر اسلام ﷺ اور آپؐ کے جانشین ائمہ اطہارؑ کی تعلیمات میں آج سے چودہ سو سال پہلے بچوں کے اُن حقوق کا تذکرہ ملتا ہے کہ جن کی یاد دہانی آج کی متمدن دنیا اور اس کے نمائندے کر رہے ہیں۔ اور بین الاقوامی حقوق میں دس نکات پر مشتمل ایک قانون بنایا جاتا ہے کہ جس میں بچوں کے حقوق کا دفاع کیا جاتا ہے اور اُن کے حقوق مقرر کیئے جاتے ہیں۔ لیکن رسول اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ نے اپنے فرمودات میں بچوں کے بارے میں جس باریک بینی کے ساتھ حقوق مقرر کئے ہیں اُن کے متعلق ابھی تک انسانی حقوق کمیشن سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب ہم اختصار کے ساتھ چہاردہ معصومینؑ کے اُن فرمودات کا مطالعہ پیش کرتے ہیں جن میں بچوں کے حقوق بیان ہوئے ہیں اور جن کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے بچوں کے شرعی حقوق مقرر کئے ہیں۔

ائمہ اہل بیتؑ کے نزدیک بچوں کے حقوق سیرت رسول خداؐ

جب کبھی کسی نومولود بچے کو دعا اور نام رکھنے کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا جاتا تو آنحضرتؐ اُسے (خندہ پیشانی کے ساتھ) اپنی آغوش مبارک میں لے لیتے۔ کبھی کبھار کوئی بچہ اگر پیغمبرؐ کے دامن مبارک کو گیلا کر دیتا اور اس کے والدین ندامت کا اظہار کرتے تو پیغمبرؐ اُنہیں منع کرتے اور فرماتے: لا تزرموا بالصبی، فیدعه حتّی یقضی بوله یعنی: "بچے کو سختی کے ساتھ پیشاب کرنے سے منع نہ کرو، اُسے آزاد چھوڑو تاکہ وہ پیشاب کر سکے۔" جب بچے کے لئے دعا اور نام رکھنے کا وقت ختم ہو جاتا تو بچے کے والدین انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ اپنے بچے کو پیغمبرؐ کی گود مبارک سے لے لیتے اور آپؐ کے چہرے پر ذرہ بھر ملالت وغصے کے آثار نہ دیکھتے۔ اور جب بچے کے والدین چلے جاتے تو رسول اکرم ﷺ اپنا لباس پاک کر لیتے۔([3])

رسول اکرمؐ نے ایک خطبے کے دوران فرمایا:وقّروا کبارکم وارحموا صغارکم ([4])ترجمہ:"اپنے بڑوں کا احترام کرواور اپنے چھوٹوں پر رحم ومہربانی کرو۔" ایک دوسری جگہ آپؐ نے فرمایا:لیس منّا مَن لم یرحم صغیرنا ولم یوقّر کبیرنا([5]) یعنی: "جو شخص ہم (مسلمانوں)کے چھوٹوں کے ساتھ رحمت ومحبت کے ساتھ پیش نہیں آتااور ہمارے بڑوں کااحترام نہیں کرتا؛وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ "امام علیؑ نے فرمایا:اِنَّ لِوَلَدِ عَلی الوالد حَقاً وِانَّ للوالد علی الولد حقاً :فحق الوالد علی الولد اَن یُطیعهُ فی کل شئ اِلاَّ فی معصیة اِلله سبحانه وحق الولدِ علی الوالد اَن یُحسِّن اسمهُ ویُحسنَ ادبه ویُعلِّمهُ القرآن. ([6]) یعنی: بچے کا باپ پر اور باپ کا بچے پر کچھ حق ہے۔ بچے پر باپ کا حق یہ ہے کہ وہ باپ کی ہر چیز میں اطاعت کرے سوائے معصیت خداکے۔اور باپ پر بچے کا حق یہ ہے کہ وہ اس کا نام اچھا رکھے اور اسے ادب سکھائے اور قرآن کی تعلیم دے۔

امام سجادؑ فرماتے ہیں:واما حق ولدک، فتعلم انه منک و مضاف الیک فی عاجل الدنیا بخیره و شره و انک مسؤول عمّا ولّیته من حُسن الادب ودلالة علی ربّه و المعونة علی طاعته فیک و فی نفسه، فمثاب علی الاحسان الیه و معاقب علی الاسائة علیه. فاعمل فی امره عمل المتزین بحسن اثره علیه فی عاجل الدنیا المعذر الی ربه فیما بینک و بینه بحسن القیام علیه و الاخذ له منه.([7]) یعنی:"اور تمہارے فرزند کا حق یہ ہے کہ تم جان لو کہ وہ تمہارے ہی وجود کا حصہ ہے۔اور اس دنیا میں اپنی نیکی اور بدی کے لحاظ سے وہ تم ہی سے نسبت رکھتا ہے۔اور اس کی تربیت اور ادب اور خدا کی معرفت کے سلسلے میں تم ہی جوابدہ ہو۔لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اسے فرمان خدا کی اطاعت کرنے میں اور جو کچھ تم سے اور اس سے تعلق رکھتا ہے،اس میں اس کی مدد کرو۔اس کے ساتھ نیکی کرنے پر تجھے ثواب ملے گا اور اس کے ساتھ بدی کی تجھے سزا ملے گی۔اس کے بارے میں تیرا عمل اس شخص کی طرح ہونا چاہیے کہ جسے بچے کے امور کی حسن ادائیگی پر اپنے کام کے دنیا میں بچے پر اچھے اثر اور آخرت میں اپنے رب کی بارگاہ میں عذر طلبی کا یقین ہو۔"

فقہ اہل بیت میں بچوں کے حقوق

فقہ اہل بیت اطہارؑ کے منابع میں ایک اہم منبع ائمہ اطہار علیہم السلام کی احادیث ہیں۔ احادیث ائمہؑ میں بچوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے جس کے چند نمونے پیش کیے گئے ہیں۔فقہائے امامیہ نے انہی احادیث

کی بناپر فقہ میں بھی کچھ ابواب بچوں کے حقوق سے مختص کیے ہیں۔ جن میں بچوں کی دینی تربیت، مالی اور معنوی نگرانی اور سرپرستی جیسے موضوعات شامل ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں فقہی احکام فقط بالغ افراد سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور نابالغ افراد کسی بھی مسئلہ میں مکلّف نہیں ہیں، یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے اور درست نہیں بھی۔ چونکہ نابالغ لوگوں کے اکثر احکام کی بازگشت بالغ افراد کی طرف ہوتی ہے اور اُنہیں شریعت نے مکلّف قرار دیا ہے کہ وہ بچوں اور نابالغ افراد کے حوالے سے اپنی شرعی ذمہ داریاں پوری کریں۔ لیکن چند ایک مسائل ایسے بھی ہیں کہ جو براہ راست نابالغ افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حدود و تعزیرات وغیرہ جیسے مسائل۔ یہاں ہم بچے کی پیدائش سے لیکر بلوغ تک فقہ اہل بیتؑ میں جو احکام بیان ہوئے ہیں اور بڑوں پر بچوں کے حوالے سے جو شرعی حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اُن کا ایک فقہی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

ولادت سے پہلے بچوں کے حقوق

شریعت اسلامیہ میں انسان کے وجود میں آنے سے پہلے کچھ چیزوں کی رعایت ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ دنیا میں آنے والا انسان جسمانی اور روحانی لحاظ سے ایک کامل انسان ہو اور اس میں خلقت کے لحاظ سے کسی قسم کا عیب نہ پایا جائے تاکہ وہ دنیا میں آنے کے بعد اپنے تکامل کے مراحل کو آسانی کے ساتھ طے کر سکے۔ اگر بچے کو وجود میں لانے والے ماں باپ ان باتوں کی رعایت نہیں کرتے تو وہ اپنے آنے والے بچے کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔

مباشرت کے احکام

جب انسان بیوی کے ساتھ مباشرت کرنا چاہے تو مستحب ہے کہ وہ دعا کرے اور خدا سے ایک پرہیزگار، بابرکت، پاک اور سالم فرزند طلب کرے۔ ([8]) اسی طرح مباشرت کے وقت خواہ شب زفاف ہو یا کوئی دوسرا وقت، کچھ باتیں مستحب ہیں اور کچھ مکروہ۔ مستحب کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان مباشرت کے وقت "بسم اللہ" کہے تاکہ شیطان، بچے کی خلقت میں حصہ نہ لے سکے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "جب بھی تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کرنا چاہے تو بسم اللہ کہے، اور اگر وہ خدا کا نام نہیں لیتا تو اس سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا کہ جس کی خلقت میں شیطان شریک ہوگا۔ ([9])

فرزندان اسلام کی حفاظت

فقہ اہل بیت اطہار علیہم السلام میں بچوں کے حقوق کا ایک مصداق یہ ہے کہ جس عورت کا وضع حمل کا وقت قریب ہو اور اس کا روزہ رکھنا اس کے حمل یعنی پیٹ میں جو بچہ ہے، اس کے لئے مضر ہو تو اس عورت پر روزہ واجب نہیں ہے۔ اور اسے چاہیے کہ ہر روز کے بدلے ایک مد طعام فقیر کو دے۔([10]) اسی طرح جو عورت بچے کو دودھ پلاتی ہو اور اس کا دودھ کم ہو (خواہ وہ بچے کی ماں ہو یا دایہ ہو یا بچے کو مفت دودھ پلا رہی ہو) اگر اس کا روزہ رکھنا دودھ پینے والے بچے کے لئے مضر ہو تو اس عورت پر روزہ رکھنا واجب نہیں ہے اور اسے چاہیے کہ ہر روز کے بدلے ایک مد طعام فقیر کو دے۔([11])

ماں یا بچے کی موت

۱۔جب بھی حاملہ عورت مر جائے اور اس کا بچہ زندہ ہو؛خواہ جنین کے زندہ رہنے کی اُمید نہ بھی ہو، پھر بھی اسے (شکم مادر) سے باہر نکالنا واجب ہے۔اگر چہ ماں کا پیٹ چاک کرنا پڑے۔([12])

۲۔ کسی مسلمان کا نبش قبر یعنی اس کی قبر کا کھولنا۔۔۔حرام ہے۔چند صورتیں ایسی ہیں جن میں قبر کا کھولنا حرام نہیں ہے منجملہ "جب کسی ایسے شرعی مقصد کے لئے قبر کھولی جائے جس کی اہمیت قبر کھولنے سے زیادہ ہو۔مثلاً کسی زندہ بچے کو ایسی حاملہ عورت کے پیٹ سے نکالنا مقصود ہو جسے دفن کر دیا گیا ہو۔"([13])

۳۔مانع حمل اشیاء کا استعمال اس وقت حرام ہے کہ جب رحم مادر میں منعقد شدہ نطفہ کے قتل کا باعث بنے۔([14])

۴۔ عورت کو صاحب اولاد ہونے سے مانع بننے کا حق نہیں ہے۔([15])

۵۔ عورت کو ایسا کوئی کام کرنے کا حق حاصل نہیں کہ وہ مرد کا نطفہ رحم سے باہر گرا دے۔اگر وہ ایسا کرے تو نطفہ کی دیت ادا کرنا اس پر واجب ہو جائے گی۔([16])

۶۔اگر انسان کسی کو اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کی حالت میں اس طرح ڈرائے کہ جس کی وجہ سے عزل واقع ہو جائے تو اسے چاہیے کہ ۱۰ دینار اس کا نطفہ ضائع ہونے کی بابت ادا کرے۔([17])

جنین کا سقط کرنا

۱۔ سوال :اسپیشلسٹ ڈاکٹر جدید آلات کو استعمال کرتے ہوئے اثناء حمل بچے کے بہت سے ناقص اعضاء کی تشخیص پر قادر ہیں۔پیدائش کے بعد معذور بچے جن مشکلات کا شکار ہوتے ہیں ؛اس مسئلہ کو سامنے رکھتے ہوئے کیا اسقاط حمل کرنا جائز ہے، جس کے ناقص رہنے کی تشخیص مورد اعتماد اسپیشلسٹ ڈاکٹر نے کر دی ہو؟ اور کیا اس کے لئے کوئی عمر معین ہے؟

جواب: صرف معذور ہونے کی وجہ سے اور یہ کہ زندگی میں کن مشکلات کا سامنا اسے کرنا پڑے گا، اسقاط حمل کا جواز نہیں بنتا۔([18])

ایک دوسرے سوال کے جواب میں رہبر معظم نے فرمایا: ”رحم میں نطفے کے ٹھہرنے اور اس کے بعد کے مراحل میں سے کسی مرحلہ میں بھی اسقاط جائز نہیں ہے۔([19])

۱۔زنا سے منعقد ہونے والے جنین کا سقط کرنا بھی حرام ہے۔([20])

۲۔سقط جنین جس وسیلہ سے بھی ہو جائز نہیں ہے اور دیت کا موجب ہے، خواہ جنین نطفہ ہی کیوں نہ ہو۔([21])

سوال: کیا ایسے حمل کو اسقاط کرنا جائز ہے جس کا نطفہ غیر مسلم کے وطی بالشبہہ یا مشتبہ مباشرت یا زنا سے ٹھہرا ہو؟

جواب: جائز نہیں ہے۔([22])

پیوندکاری والی اولاد

۱۔جو بچہ حلال تلقیح کے ذریعے پیدا ہوا ہو تو وہ دوسری اولاد کی طرح ہے اور اپنے محارم کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔([23])

۲۔جو لڑکا یا لڑکی مصنوعی نطفہ سے اور مصنوعی رحم میں متولد ہوئے ہوں، آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ چونکہ ان کے درمیان کسی قسم کی نسبت نہیں پائی جاتی۔اگرچہ اُن کا نطفہ ایک ہی سبب سے لیا گیا ہو۔([24])

۳۔جو لڑکا اور لڑکی ایک ہی مرد کے نطفہ سے مصنوعی رحم میں پرورش پا کر متولد ہوئے ہوں؛ باپ کی طرف سے ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں۔(لہٰذا) اُن کی ایک دوسرے کے ساتھ شادی جائز نہیں۔ اسی طرح باپ کی طرف سے محرم افراد کے ساتھ بھی اُن کی شادی جائز نہیں۔([25])

۴۔جو لڑکا اور لڑکی مصنوعی نطفہ سے ایک ہی عورت کے رحم میں پرورش پا کر متولد ہوئے ہوں؛ وہ ماں کی جانب سے بہن بھائی ہیں۔اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے۔اسی طرح ماں کی طرف سے محرم افراد کے ساتھ بھی اُن کی شادی جائز نہیں۔([26])

۵۔اگر کسی مرد کی منی مصنوعی طور پر مصنوعی بچہ دانی میں (جسے بے بی ٹیوب کہتے ہیں) بچہ پیدا کرنے کی غرض سے رکھ دیا جائے تو یہ کام جائز ہے اور بظاہر بچہ اُسی کا ہوگا جس کی منی ہو اور اُن کے درمیان وہ تمام

احکام جاری ہوں گے جو ایک باپ اور بیٹے کے درمیان ہوتے ہیں۔اس قسم کے بچے اور دوسرے بچوں میں صرف فرق یہ ہے کہ اُس کی ماں نہیں ہے۔([27])

۶۔ شوہر کی منی زوجہ کے رحم میں مصنوعی طریقے سے پہنچانا جائز ہے اور اُس سے پیدا ہونے والا بچہ عام اولاد کی طرح ہے۔ لیکن اگر انجکشن لگانے والا اجنبی ہو اور انجکشن عورت کی شرمگاہ کو دیکھنے یا چھونے کا سبب ہو تو یہ کام جائز نہیں ہے۔([28])

۷۔ مصنوعی پیوندکاری اور حمل کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں آیت اللہ خامنہ ای لکھتے ہیں: بچہ صاحب نطفہ سے ملحق کیا جائے گا۔اور مذکورہ طریقے سے پیدا ہونے والا بچہ صاحب نطفہ ماں باپ کا ہوگا۔([29])

ولادت کے بعد بلوغ تک بچوں کے حقوق

بچے کو غسل دینا

۱۔ نومولود کو غسل دینا مستحب ہے۔([30])

۲۔ نومولود کو اس صورت میں غسل دینا مستحب ہے کہ غسل دینا اس کے لئے، مضر نہ ہو۔([31])

۳۔ اگر نومولود کو غسل دینے میں دو تین دن کی تاخیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر اتنی تاخیر کی جائے کہ عرف عام میں اسے نومولود نہ کہیں تو بہتر ہے اسے رجائً غسل دیا جائے۔([32])

گھٹی پلانا

۱۔ مستحب ہے کہ نومولود کو آب فرات اور تربت سید الشہدا علیہ السلام پلایا جائے۔([33])

اذان واقامت کہنا

۱۔ مستحب ہے نومولود کے دائیں کان میں اذان، بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔([34])

نام رکھنا

۱۔ مستحب ہے کہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد اس کو اچھے نام سے موسوم کیا جائے کیونکہ بچے کا باپ پر حق ہے کہ وہ اس کو اچھے نام سے موسوم کرے۔اور سب سے اچھا نام وہ ہے جس میں اللہ کی عبودیت کا ذکر ہو مثلاً عبد اللہ، عبد الرحیم، وغیرہ۔اور اس کے بعد اچھا نام وہ ہے جو انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے ناموں پر ہو اور ان میں سب سے بہتر نام محمد ہے۔بلکہ اگر چار بچے ہوں تو ان میں ایک کا نام محمد نہ رکھنا مکروہ ہے۔([35])

سر مونڈنا

اور مستحب ہے کہ ساتویں دن بچے کا سر مونڈے اور اس کے بالوں کے وزن کے برابر سونا یا چاندی صدقہ دے اور ایک جگہ سے سر مونڈنا اور ایک جگہ سے چھوڑ دینا مکروہ ہے۔([36])

ختنہ کرنا

ا۔لڑکے کا ختنہ کرنا واجب ہے۔اور مستحب ہے ساتویں روز ختنہ کرائے اور تاخیر بھی جائز ہے۔اور اگر اس قدر تاخیر کرے کہ لڑکا بالغ ہو جائے تو لڑکے پر واجب ہے کہ وہ اپنا ختنہ کرائے۔

۲۔ختنہ بذات خود واجب ہے اور اس کے حج وعمرہ کا طواف صحیح ہونے کی شرط ہے چاہے حج وعمرہ واجب ہوں یا مستحب۔اور اقویٰ یہ ہے کہ ختنہ نماز کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے چہ جائیکہ دوسری عبادات کی شرط ہو۔([37])

عقیقہ

بچے یا بچی دونوں کی کے لئے عقیقہ کرنا مستحب موکدہ ہے۔اور مستحب ہے کہ لڑکے کی طرف سے نر اور لڑکی کی طرف سے مادہ جانور عقیقہ کیا جائے اور یہ کہ ساتویں دن عقیقہ کرے۔لیکن اگر عذر یا بغیر عذر کے عقیقہ کو تاخیر میں ڈالے تو ساقط نہیں ہو گا۔حتیٰ اگر بچہ بالغ ہو جائے اور اس کا عقیقہ نہ ہوا ہو تو وہ خود اپنی طرف سے عقیقہ کرے بلکہ اگر وہ زندگی میں عقیقہ نہ کرسکے تو مستحب ہے کہ مرنے کے بعد اس کی طرف سے عقیقہ کیا جائے۔اور تین جانوروں یعنی بھیڑ، بکری، اونٹ میں سے کوئی جانور عقیقہ میں ذبح ہونا چاہیے۔([38])

ولادت کا ولیمہ

بچے کی پیدائش کے موقعہ پر ''ولیمہ '' مستحب ہے اور یہ ان پانچ مواقع میں سے ایک ہے کہ جن میں ولیمہ مستحب ہوتا ہے۔جیسا کہ ان میں ایک ختنہ کا موقع ہے۔ولادت کا ولیمہ ولادت ہی کے دن کرنا معتبر نہیں ہے بلکہ ولادت کے تھوڑے دن بعد بھی کر سکتا ہے۔([39])

بچے کو دودھ پلانا

مستحب ہے کہ بچے کو ماں کا دودھ پلایا جائے۔اس لئے کہ وہ غیر کی نسبت زیادہ بابرکت ہے۔اگر بعض جہات کی وجہ سے دوسری عورت بہتر ہو مثلاً شریف ہو، اس کا دودھ پاکیزہ ہو اور ماں کا دودھ پاکیزہ نہ ہو تو دوسری عورت دودھ پلائے۔ مکمل طور پر دودھ پلانے کی مدت پورے دو سال ہے۔یعنی چوبیس مہینے۔ اور تین مہینے اس میں سے کم کرنا جائز ہے۔مثلاً اکیسواں مہینہ پورا ہونے کے بعد دودھ چھڑادے لیکن اگر دودھ پلانا ممکن ہو اور دودھ چھڑانے کی ضرورت نہ ہو تو اس سے کم کرنا جائز نہیں ہے۔([40])

بچے کی نگہداشت

بچہ کی حفاظت، اس کی تربیت اور دودھ پلانے کی مدت دوسال تک اس کی نگہداشت جیسے اُمور کی زیادہ حقدار اس کی ماں ہے بشرطیکہ وہ آزاد، مسلمان، عقلمند ہو چاہے بچہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ماں خود دودھ پلائے یا کسی اور کو دودھ پلانے کی ذمہ داری سونپے۔پس اس عرصہ کے دوران احتیاطاً باپ کے لئے جائز نہیں کہ وہ بچے کو ماں سے جدا کرے۔اگرچہ ماں نے بچے کا دودھ چھڑا دیا ہو۔لہٰذا جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہو جائے تو باپ بیٹے کی نسبت زیادہ حقدار ہے اور ماں بیٹی کی نسبت یہاں تک کہ وہ سات سال کی ہو جائے۔سات سال کے بعد باپ اس کی نسبت زیادہ حقدار ہے۔([41])

بچے کی خوراک اور غذا

بچوں کو نجاست یا نجس چیز کھلانا:

۱۔بچوں کو عین نجاست کھلانا حرام ہے۔([42])

۲۔بچوں کو ہر مست کنندہ چیز کھلانا حرام ہے۔([43])

۴۔اگر کسی شخص کے پاس وضو کی مقدار تک پاک پانی ہو اور بقیہ پانی نجس ہو تو اس صورت میں اگر اُسے ڈر ہو کہ کوئی بچہ پیاس سے نقصان میں پڑ جائے گا تو اس وقت نجس پانی اسے دے سکتا ہے اور پاک پانی سے وضو کر سکتا ہے۔([44])

بچے کی سرپرستی اور ولایت

بچے کی سرپرستی اور ولایت بالترتیب درج ذیل افراد کے ذمہ ہے:

۱۔باپ اور دادا ۲۔باپ کا وصی یا دادا کا وصی کہ جسے بچے کا سرپرست مقرر کیا گیا ہے۔

۳۔حاکم شرع ۴۔عادل مومنین۔

بچے کے ولی کی شرائط

بچے کی سرپرستی اور ولایت اپنے ذمہ لینے والے افراد میں درج ذیل شرائط ہونی چاہیں:

۱۔بالغ وعاقل اور آزاد ہو۔

۲۔اگر بچہ مسلمان ہے تو اس کا ولی بھی مسلمان ہونا چاہیے ([45])

نوٹ :اگر کسی بچے کا باپ کافر ہے تواس بچے کی ولایت اس کے دادا کے ساتھ مختص ہو جائے گی۔اور اگر وہ بھی کافر ہے تو بچے کا ولی حاکم شرع ہوگا۔([46])

*****

حوالہ جات

1 ۔التوبہ/122۔
2۔احمدی،اسلام وحقوق کودک،ص19۔
3۔بحار الانوار،ج6،ص153۔
4۔عیون اخبار الرضا،ص 163۔
5۔ مجموعہ ورام،ج1،ص34۔
6۔ نہج البلاغہ، کلمات حکمت 391۔
7۔تحف العقول عن آل الرسولؐ،رذیل سخنان سجادؑ۔
8۔ تحریر الوسیلہ،ج2،ص239،م8۔
9۔ ایضاً
10۔توضیح المسائل،مسئلہ 1737۔
11۔توضیح المسائل،مسئلہ 1738۔
12۔توضیح المسائل(اردو ایڈیشن)،مسئلہ 634۔
13۔توضیح المسائل(اردو ایڈیشن)،مسئلہ 650۔
14۔استفتائات(اردو ایڈیشن)، ج1،ص70۔
15۔مجمع المسائل، ج1،ص552۔
16۔عروۃ الوثقیٰ،ج2،ص809۔
17۔ تحریر الوسیلہ،ج2،ص598۔
18۔استفتائات،ج2،ص105۔
19۔ایضاً سوال180۔
20۔مسائل وردود ص94،م269۔

21۔ مجمع المسائل، ج3 ، ص244۔
22۔استفتائات، ج2، ص109۔
23۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص266۔
24۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص623۔
25۔ایضاً
26۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص622۔
27۔خوئی توضیح المسائل، مسئلہ 2898۔
28۔خوئی، توضیح المسائل، مسئلہ 2899۔
29۔آیت اللہ خامنہ ای (اُردو ایڈیشن)، استفتائات، ج2، ص111 س189۔
30۔توضیح المسائل، خوئی، مسئلہ 651۔
31۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص310۔
32۔عروۃ الوثقی، ج1، ص465۔
33۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص310۔
34۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص310۔
35۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص310۔
36۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص310۔
37۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص310۔
38۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص315۔
39۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص310۔
40۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص315۔
41۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص315،1۔
42۔خوئی، منہاج الصالحین، ج2، ص310۔
43۔یزدی، عروہ، ج1، ص93۔
44 ۔یزدی، عروہ ج1 ص۴۷۷
45۔ تحریر الوسیلہ، ج2، ص256۔
46۔یزدی، عروہ ج2، ص869۔

نماز میں ارسال الیدین کا حکم

(ارسال کے جواز اور تکتف کی حرمت کے بارے میں ایک تحقیق)

The Status of Openinhg Hands while Praying

ابن ذاکر موسوی

ا۔اسلام میں نماز کی اہمیت

شرعی اصطلاح میں رکوع و سجود اور قرائت وذکر پر مشتمل مخصوص عمل کو نماز کہتے ہیں کہ جو نیت اور خاص شرائط کے ساتھ تکبیر کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور سلام پر ختم ہو جاتا ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے ہوئے اپنی بندگی کا اظہار کرے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس سے اپنی بندگی کی تجدید عہد کرے۔ نماز اصول دین کے بعد اہم ترین واجبات میں سے ہے اور شریعت کے پنجگانہ اراکین (نماز، روزہ، زکات، حج وجہاد) میں سے ایک ہے۔ نماز دین کا ستون ہے اور قرآن کی نظر میں نماز انسان کو بُرائی اور فحشاء سے روکتی ہے اور گناہوں کا کفارہ ہے اور حوائج تک رسائی اور مصائب وشدائد سے نجات کا ذریعہ ہے۔ نماز کا حکم مکہ میں بعثت کے اولین ایام میں نبی اکرمؐ پر نازل ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ مشہور ہے اس کی کیفیت اور رکعتوں کی تعداد شب معراج نازل ہوئی ہے۔ قرآن اور کتب حدیث میں نماز کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ نقل ہوا ہے کہ جن میں سے چند ایک کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے: فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا[1] ترجمہ: ”نماز کو قائم کرو کیونکہ نماز نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے حساب سے فرض ہے۔“ نیز فرمایا: وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ[2] ترجمہ: ”اور (مشکل وقت میں) صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو اور خشوع کرنے والوں کے علاوہ دوسروں پر یہ کام گراں ہے۔“

ترقی کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے دو بنیادی ارکان کی ضرورت ہے۔ایک طاقت ور اور مضبوط اندرونی قلعہ اور دوسرا بیرونی محکم سہارا۔ مندرجہ بالا آیت میں ان دونوں اساسی ارکان کو صبر وصلوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ صبر استقامت اور بُردباری کے ساتھ مشکلات کے محاذ پر ڈٹ جانے کا نام ہے اور نماز خدا سے رابطے اور تعلق کا وسیلہ ہے۔ جو ایک مضبوط اور محکم سہارا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے

ہیں جب دنیا کے غموں میں سے کسی کا سامنا ہو تو وضو کرو اور مسجد میں جا کر نماز پڑھو اور پھر دعا کرو۔ کیونکہ خدا نے خود ہی حکم دیا ہے: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ نماز کی طرف توجہ اور راز و نیاز انسان میں نئی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ کتاب کافی میں منقول ہے کہ جب بھی حضرت علیؑ کو کوئی سخت مشکل در پیش ہوتی تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور پھر اس آیت کی تلاوت کرتے: وَاستَعِينُوا بِالصَّبرِ وَالصَّلٰوةِ۔

رسول اکرمؐ کا فرمان ہے: ''نماز دین کا ستون ہے جو بھی اسے چھوڑے گا وہ اپنے دین کو منہدم کر دے گا۔'' نیز آپؐ نے فرمایا: ''اپنی نمازوں کی حفاظت کرو چونکہ قیامت کے دن سب سے پہلی چیز جس کے بارے میں سوال ہو گا، وہ نماز ہے۔ اگر اسے درست انجام دیا تو فلاح پا جاؤ گے ورنہ آتش میں ڈال دیئے جاؤ گے۔'' جنگ صفین کے دوران ایک دن ابن عباسؓ نے دیکھا کہ جنگ اور قتل و غارت اپنے عروج پر ہے لیکن علی ابن ابی طالب علیہ السلام دونوں لشکروں کے درمیان کھڑے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ابن عباسؓ نے پوچھا: یا علیؑ آپ کیا کر رہے ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں ظہر کا وقت ہوا ہے یا نہیں اور میں نماز پڑھوں یا نہیں۔ ابن عباسؓ نے کہا: یہ کونسا وقت ہے نماز پڑھنے کا، اس وقت تو جنگ عروج پر ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ''ہم اس گروہ سے کس لئے لڑ رہے ہیں؟ ہم نماز کے لئے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے ہی تو لڑ رہے ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں: علیؑ نے کبھی نماز شب ترک نہیں کی حتیٰ لیلة الحریر کو بھی کہ جب بہت ہی خوفناک رات تھی اور ہر دو لشکر ایک دوسرے پر حملہ آور تھے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "ہمارے پیروکاروں کا نماز کے وقت امتحان کرو۔ کہ وہ نماز کا کس قدر خیال کرتے ہیں۔" ([3]) امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: "اگر نماز گذار جانتا کہ نماز کی حالت میں اپنے پروردگار کی جانب سے کس قدر رحمت اسے گھیر لیتی ہے تو وہ ہرگز سجدے سے سر نہ اُٹھاتا۔" اُصول دین میں توحید پر اعتقاد سب سے مقدم ہے اور فروعات دین میں نماز ہر چیز پر مقدم ہے۔ پس نماز دین کا رکن ہے اور عبادت کی اصل و اساس شمار ہوتی ہے۔ اسی لئے آخرت میں سب سے پہلے نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا:

روز محشر کہ جاں گداز بود اولین پُرسش نماز بود

اس دن اگر انسان کی نماز قبول ہو گئی تو باقی اعمال بھی قبول ہو جائیں گے اور اگر نماز رد ہو گئی تو دوسرے نیک اعمال بھی رد ہو جائیں گے۔ چونکہ اصل، فرع پر مقدم ہوتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام معصومؑ سے منقول ہے: الصَّلٰوةُ اِن قُبِلَت قُبِلَ مَا سِواهَا وَاِن رُدَّت رُدَّ مَا سِواهَا.

اب جبکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک نماز کی اہمیت مسلمّ الثبوت ہے اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ آخرت میں فلاح و سعادت نماز کے درست ہونے کی مرہون منت ہے اور درست نماز کے بغیر انسان کبھی بھی فلاح یافتہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نماز اور اس کے احکامات کے صحیح اور درست ہونے کے بارے میں یقین بھی ضروری ہے اور انسان کو توجہ رکھنی چاہیے کہ اس کی نماز اور عبادت شریعت اسلام کے احکامات اور پیغمبر اسلامؐ کی سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔

۲۔ نماز کا توقیفی ہونا

نماز اسلام میں اہم ترین عبادت ہے کہ جس کی اہمیت گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔ لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اسی اہم ترین فریضہ کے بارے میں بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رکھا ہے اور اُنہیں ذرہ بھر پرواہ نہیں کہ وہ اپنی نماز درست انجام دیتے ہیں یا نہیں؟ نماز ایک دینی فریضہ اور شرعی عبادت ہے، اور اس کے توقیفی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ یعنی؛ نماز کے فرائض اور احکامات فقط شارع مقدس کی جانب ہی نازل ہوئے ہیں اور کسی دوسرے کو حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اُن میں ردوبدل کرے۔ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے: صَلُّوا كَمَا رَأَيتُمُونِي أُصَلِّي یعنی: "نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا دیکھو۔"

لہٰذا نماز ایک شرعی اور توقیفی حکم ہے اور پیغمبر اسلامؐ خود مامور ہیں کہ وہ اس شرعی عبادت کو انجام دیں اور دوسروں کو بھی اس کی انجام دہی کا طریقہ سکھائیں: ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا ترجمہ: "پھر تجھے ایک شریعت پر قرار دیا ہے؛ پس اس کی پیروی کرو۔" لہٰذا شریعت کے دستور کے مطابق عمل کرنا سب کا فریضہ ہے۔ حتیٰ پیغمبر اسلامؐ پر بھی شریعت کی پیروی لازم ہے۔ پس عقلاً واجب ہے کہ اسلامی نماز ایک ہی ہئیت اور شکل میں ہو اور محال ہے کہ شارع مقدس کی جانب سے نماز جیسی عبادت مختلف انداز میں اور گوناں گوں شکلوں میں نقل ہوئی ہو اور حق تعالیٰ کے حضور قابل قبول ہو۔ اسی طرح محال ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے، جو خود شریعت کے بیان کرنے والے ہیں، مختلف طریقوں سے نماز ادا کی ہو اور نماز جیسی اہم ترین عبادت کی مختلف انداز میں اپنی اُمت کو تعلیم دی ہو۔ جب خود پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کو تاکید فرماتے ہیں کہ نماز اس طرح پڑھنا جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ یعنی عبادت الٰہی کے سلسلے میں وہی طریقہ اور روش حق تعالیٰ کو قبول ہے کہ جو میں نے تمہیں سکھایا ہے۔ حتیٰ مسنون دعاؤں میں بھی حکم یہ ہے کہ مسلمان معصومین علیہم السلام کی تعلیم کے مطابق دعا کریں اور اپنی طرف سے کوئی دعا ایجاد نہ کریں۔

پس نماز میں رسول اکرمؐ کی اطاعت واجب ہے اور پیغمبر اکرمؐ کا یہی فرمان نماز کے توقیفی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ لہٰذا اگر مسلمان اپنی نماز رسول اکرمؐ کی نماز کے مطابق ادا نہیں کرتے اور نماز کو مختلف انداز میں بجا لاتے ہیں تو یقیناً نماز میں وہ رسول اکرمؐ کی اطاعت نہیں کرتے۔اس وقت نماز کے بارے میں مسلمانوں میں تقریباً اُنیس اختلافات پائے جاتے ہیں۔جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔ اور یہ اختلاف یقیناً نماز کے باطل ہونے کا سبب ہے۔اگر مسلمان اپنی نمازوں کی تصحیح نہیں کرتے اور اور اسی فرق کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں تو یقیناً اس آیہ مجیدہ کے مصداق قرار پاتے ہیں :عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً[4] یعنی: "وہ جنہوں نے ہمیشہ عمل کیا ہے اور تھک چکے ہیں دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔" اور اُن کی ہر نماز اُنہیں جہنم کی طرف لے جارہی ہے :قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا[5] یعنی: "کہہ دو: کیا ہم تمہیں خبر دیں کہ زیادہ خسارے میں کون ہے ؟وہ لوگ جن کی ساری کوششیں دنیوی زندگی میں بھٹک کر رہ گئی ہیں اوراس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں۔ "

بہر حال ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی نماز کے بارے میں تحقیق کرے کہ آیا وہ اسی طریقے کے مطابق نماز ادا کرتا ہے کہ جو طریقہ پیغمبر اسلام ﷺ نے سکھایا ہے یا وہ نماز جیسی اہم ترین عبادت کو اپنی مرضی، خواہشات اور دوسروں کی اندھی تقلید کے مطابق بجالارہا ہے۔اور یہ مسئلہ انتہائی اہم ہے جس کے بارے میں توجہ ضروری ہے۔

۳۔ مسلمانوں کا نماز کے بارے میں اختلاف

بعض علل واسباب کی وجہ سے مسلمانوں میں نماز کے احکام کے بارے میں کچھ نظری اور عملی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اختلاف تو اہل سنت اور شیعہ مسلمانوں کے درمیان ہیں اور کچھ خود مذاہب اہل تسنن کے درمیان ہیں۔ مسلمانوں کے بڑے دو اہم مذاہب یعنی ؛شیعہ و سنی کے درمیان نماز کے بارے میں دس اہم اختلاف ہیں :

اول:اعضائے وضو کے دھونے کے بارے میں اختلاف کہ اہل سنت ہاتھوں کو نیچے سے اوپر کی طرف دھوتے ہیں۔ جبکہ شیعہ ان کے بر خلاف اور فطرت انسان کے مطابق اعضائے وضو کو اوپر سے نیچے کی طرف دھوتے ہیں۔

دوم: پاؤں کے مسح کے بارے میں اختلاف ہے۔اہل سنت کے ائمہ فقہ وضو میں پاؤں کے دھونے کو واجب تعینی جانتے ہیں۔زیدیہ مذہب کے علماء پاؤں کا مسح اور دھونا ہر دو واجب سمجھتے ہیں۔لیکن کچھ علمائے اہل سنت ان دونوں کو اختیاراً کافی جانتے ہیں جبکہ علمائے امامیہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی پیروی میں وضو میں مسح کو واجب تعینی جانتے ہیں۔

سوم: تکبیر میں رفع یدین کرنا نہ کرنا، شیعہ رفع یدین کرتے ہیں۔اہل سنت بعض کرتے ہیں بعض نہیں کرتے۔

چہارم: قرائت سورہ میں بسم اللہ کو بلند آواز سے کہنے اور نہ کہنے میں اختلاف۔شیعہ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھتے ہیں جبکہ اہل سنت بلند پڑھنا ضروری نہیں سمجھتے۔

پنجم: نماز میں سورہ حمد کی قرائت کے بعد آمین کہنا یا نہ کہنا، بعض اہل سنت کہتے ہیں اور بعض نہیں کہتے۔ جبکہ امامیہ اسے بدعت سمجھتے ہیں۔

ششم: چھٹا اختلاف نماز میں ارسال الیدین اور قبض الیدین کا ہے۔شیعہ نماز میں ارسال کرتے ہیں اور اسے واجب قرار دیتے ہیں اور اس کے بغیر شیعہ کے نزدیک نماز باطل ہے۔جبکہ اہل سنت نماز میں قبض یدین کرتے ہیں یعنی ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔اور یہی مسئلہ ہمارا موضوع ہے۔جس کے بارے میں آئندہ صفحات میں تفصیل بیان کی جائے گی۔

ہفتم: تشہد یا التحیات۔شیعہ دوسری رکعت میں بیٹھ کر تشہد پڑھتے ہیں اور اہل سنت بھی اسے پڑھتے ہیں اور اسے التحیات کہتے ہیں۔اسی طرح شیعہ دوسرے رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے ہیں اور اہل سنت نہیں پڑھتے۔

ہشتم: دونوں کا سلام پھیرنے کا طریقہ مختلف ہے۔اہل سنت سلام دیتے وقت قبلہ سے منہ پھیر لیتے ہیں اور شیعہ اس کو نماز کے باطل ہو جانے کا سبب سمجھتے ہیں۔اور وہ صرف گوشہ چشم کے اشارے سے سلام پھیرتے ہیں۔

نہم: جمع بین الصلاتین کا مسئلہ ہے شیعہ ظہرین اور مغربین کو ملا کر پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں جبکہ اہل سنت جدا جدا پڑھتے ہیں۔

دہم: اذان اور اقامت میں اختلاف ہے کہ اہل سنت { حی علی خیر العمل } اذان میں نہیں کہتے جبکہ شیعہ

اسے اذان واقامت کا جز سمجھتے ہیں اور اہل سنت صبح کی نماز میں {الصلوٰۃ خیرٌ من النوم} کہتے ہیں اور شیعہ اسے باطل سمجھتے ہیں۔

۴۔ارسال الیدین از نظر تشیع و تسنن

اختلاف نماز کے منجملہ مسائل میں ایک ارسال الیدین اور قبض الیدین ہے۔ارسال الیدین یعنی؛نماز میں ہاتھوں کو کھلا چھوڑنا اور اس کے مقابلے میں قبض یدین یعنی؛ میں نماز ہاتھ باندھنا ہے۔ہمارے فقہاء نے اسے تکتف یا تکفیر سے تعبیر کیا ہے۔(قاموس کے مطابق) کتف بفتح کاف وسکون تاء ایک ہاتھ پر دوسرے ہاتھ کو باندھنا ہے۔(جامع عباسی کی تعریف کے مطابق) ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا کتف کہلاتا ہے۔ (شرح لمعہ میں ہے) دونوں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی کلائی پر ناف کے اوپر یا نیچے رکھنا کتف ہے۔امامیہ کے نزدیک اس کا تفصیلی حکم اپنی ادلہ کے ساتھ بعد میں بیان کیا جائے گا۔فی الحال اہل سنت کے نزدیک قبض یدین کا مسئلہ پیش کیا جاتا ہے اور دیکھتے ہیں کہ نماز میں تکتف یا تکفیر یا قبض یدین کی کیا حیثیت ہے؛واجب ہے یا مستحب یا مکروہ ہے۔اہل سنت کے فقہی اور روائی کتب سے پتا چلتا ہے کہ نماز میں تکتف یا تکفیر ایک نزاعی مسئلہ ہے۔اور اس مسئلہ میں اُن کے فقہاء میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔یہاں ہم کچھ عبارات نقل کرتے ہیں کہ جن قبض یدین کے بارے میں اختلاف واضح ہوتا ہے۔

قبض یدین کے بارے میں اہل تسنن کا اختلاف

<u>ا۔علامہ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں:</u>

وَاجْمَعُوْا عَلیٰ اَنَّهُ یُسَنُّ وَضْعُ الْیَمِیْن عَلیٰ الشِّمَالِ فِی الصَّلٰوةِ اِلّاَ فِیْ رَوَایَةٍ عَنْ مَالِک وَهِیَ الْمَشْهُوْرَةُ اَنَّهُ یُرْسِلُ یَدَیهِ اِرْسَالاً وَقَالَ الْاَوْزَاعِی بِالتَّخِییر واختَلَفُوا فِی مَحَلِّ وَضعِ الیَدَینِ فَقَال اَبُوحَنِیفَةُ تَحتَ السُّرَّةِ وَقَالَ مالِکُ وَالشَافعِی تَحتَ صَدرَه فَوقَ سُرَّةٍ وَ عَن اَحمَد رِوَایتَانِ اَشهَرُهُماَ هِیَ اللّتِی اَختَارَهَا الخُرَقِی کَمَذهَبِ اَبِی حَنِیفةِ.([6])

یعنی: "اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا سنت ہے۔سوائے امام مالک کی ایک روایت کے جو مشہور ہے کہ وہ ہاتھوں کو نماز میں کھلا رکھتے تھے۔اور امام اوزاعی نے کہا ہے کہ نمازی مختار ہے چاہے ہاتھ باندھے چاہے کھولے۔اور محل وضع میں اختلاف ہے۔امام ابو حنیفہ کہتے ہیں

ہاتھ ناف کے نیچے باندھے اور امام مالک و شافعی کہتے ہیں: کہ سینے کے اوپر رکھے اور امام احمد سے دو روایتیں منقول ہیں؛ مشہور وہ ہے جس کو حزقی نے اختیار کیا ہے یعنی مذہب ابو حنیفہ کے مطابق۔"

۲۔ صاحب میزان الکبریٰ لکھتے ہیں :

وَمِنْ ذَالِکَ اِتّفَاقُ الْاَئِمَّةِعَلٰی استحباب وَضَعِ الْیَمِیْنِ عَلٰی الشِّمَالِ فِی الْقِیامِ وَمَا قَامَ مَقَامَهُ مَعَ قَوْلِ مَالکْ فی اشهرروایات اَنَّهُ یُرْسِلُ یَدَیه ارسال ومع قول الاوزاعی انَّه یَتَخَیَّرُ والاول مَشَدَّدٌ وَالثَّانِی ومابعده مخفف وان تفاوت التخفیف ووجه الاول ان صورة موقف العبد بین یدی سیّده وهو خاص بالاکابر من العلما الاولیا بخلاف الاصاغِر فاِنّ الْاَوْلٰی لَهُمْ اِرْخاء الیدین کما قال بهٖ مالک۔وایضاح ذٰلک انَّ وَضَعَ الیمین عَلیَ الیسار یحتاجُ فی مَرَاعاتِهٖ اِلٰی صَرَف الذّهنِ الیه فیخرجُ بذالک کمال الاقبال عَلٰی مُنَاجاة الله عزوجل الذی هی رُوحُ الصلٰوة وحقیقتها بخلاف ارخائهما بجنبیه.

ثم اختلفوا فی محل وَضَعِ الیدین ۔فقالَ ابُوحنیفُه:۔تحت السَرَّه وقال مالک والشافعی تحت صَدْره فوق سُرّته وعَن احمد روایتان اشهرهُما فمذهب ابی حنیفة واختارها الخرقی ووجه الاول خفت کونها تحت السرة علی المصلّی بخلاف وضعها تحت الصدر فانه یحتاج اِلٰی مراعاتها لثقل الیدین وتدلیها اذا طالَ الوقوفُ فرجع الامرُ اِلٰی مرتبتی المیزانِ فلذالِکَ کانَ استحبابُ وضع الیدین تحتِ الصدر خاصاً بالاکابِرِ الّذیْن یقدرون علٰی مراعَاةِ الشّیئَین معاً فی اٰن واحدٍ دُون الاصاغر.

وسمعت سیدی علی الخواص یقول وجه قول من قال بعدم استحباب وضع الیدین تحت الصدرِ مَعَ ورُود ذالک من فعل فِعُل الشارع کون مَرَاعات المصلی ودوامها تحت الصدر یشغله غالبًا من مراعاة کمال الاقبال علی مناجاة الله فکان ارسالهما ارجعلهما تحت السرة کما قال الاقبال عَلٰی المناجاة و الحضور مع الله اولٰی من مراعاة هیئة من الهیئَات فمن عَرَفُ من نفسه العجز عن مراعاة کون یدیه تحت صدره فی الصلٰوة الّا مع الغفلة عن کَمَال الاقبال علی الله عزوجل. فَارسال یدیه بجنبه اولی به و صرح الشافَعِیُّ فی الْاُمّ فقال وان ارسلهما وَلَم یَعْبَثْ بها فَلَا باس ومن عَرَفَ من نفسهِ الْقُدرة عَلی الجَمْع بین الشیئین مَعًا فِی اٰنٍ واحِدٍ کان وضع یدیه تحت صَدْرهُ اولٰی وَبذالِک یحصل الجمع بَیْنَ اَقْوَال الائمة رضی الله عنهم .([7])

اور منجملہ مسائل نماز یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قیام نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا مستحب ہے۔ حالانکہ امام مالک کا قول مشہور ترین روایات میں سے ہے کہ وہ ہاتھوں کو نماز میں لٹکائے رکھتے تھے۔اور پورے طور سے کھلے رکھتے اور امام اوزاعی کا قول ہے کہ نمازی مختار ہے چاہے ہاتھ کھول کر پڑھے یا باندھ کر۔پس پہلا قول سخت ہے۔اور دوسرے قول میں تخفیف ہے اگر چہ تخفیف میں تفاوت ہے۔قول اول یعنی ؛باندھنے کی وجہ یہ ہے کہ عبد کی صورت اپنے رب کے سامنے ایسی ہی ہونی چاہیے۔اور یہ صورت مخصوص ہے اکابر علماء اولیاء کے لئے۔برخلاف عامہ مومنین کے۔ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ ہاتھ کھلے رکھیں۔جیسا کہ امام مالک کا مذہب ہے۔اور اس کی توضیح یہ ہے دائیں ہاتھ کے بائیں پر رکھنے سے ذہن بٹا رہتا ہے اور توجہ واخلاص میں کمی آجاتی ہے۔جبکہ اصل روح نماز یہی توجہ الی اللہ یعنی؛ خشوع وخضوع ہے جو نماز کی جان ہے؛ہاتھ کھلے رکھنے ہی کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

پھر اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ ہاتھ کہاں رکھے جائیں۔امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ زیر ناف رکھے جائیں۔ اور امام مالک اور امام شافعی کا کہنا ہے کہ سینے کے نیچے اور ناف کے اوپر رکھے جائیں۔امام احمد سے دو روایتیں منقول ہیں۔ مشہور وہ ہے جو امام ابو حنیفہ کے موافق ہے اور اسی کو خرقی نے اختیار کیا ہے۔زیر ناف ہاتھ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ہاتھ رکھنے سے نمازی پر بوجھ نہ پڑے گا۔برخلاف اس کے اگر سینے پر ہاتھ رکھے جائیں تو نمازی کو ہر وقت ان کے سنبھالنے کا خیال رہے گا کیونکہ ہاتھ خود بھاری چیز ہے۔اور فطرتاً نیچے لٹکنا چاہتا ہے۔جبکہ دیر تک قیام رہے تو اب میزان کے دونوں طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اس لئے سینے کے نیچے ہاتھ رکھنا اکابر علماء واولیاء کے لئے مستحب ہوا جو دونوں ہاتھوں کو سنبھالنے اور توجہ قائم کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ادنیٰ درجے کے مسلمانوں کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔وہ اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ دونوں باتوں کا خیال رکھیں۔

میں نے سید علی الخواص سے سنا ہے۔وہ فرماتے تھے کہ جو اس کے قائل ہیں کہ سینے کے نیچے ہاتھ نہ رکھنے چاہیں حالانکہ یہ فعل شارع سے ثابت ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سینے پر ہاتھ رکھنے سے رجوع قلب حاصل نہیں ہوتا۔جبکہ اصل رجوع اور حضور قلب ہی ہے۔اس لئے ہاتھوں کا کھولنا یا ناف کے نیچے رکھنا ہی بہتر ہوا کسی اور ہئیت سے۔پس جو شخص توجہ الی اللہ اور ہاتھوں کے سنبھالنے سے عاجز ہو تو اس کے لئے ہاتھوں کا کھولنا ہی مناسب ہے اور اسی کی امام شافعی نے کتاب الام میں تصریح فرمائی ہے اور کہا ہے اگر ہاتھ کھلے

رکھے اور اُن سے کھیلے نہیں تو ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے میں کوئی ہرج نہیں اور جو اپنے اندر دونوں باتوں کی قدرت پاتا ہے کہ ہاتھ باندھے بھی رہیں اور توجہ بھی قائم رہے تو اس کے لئے زیر صدر ہاتھ باندھنے ہی بہتر ہیں اور اس سے اقوال ائمہ میں جمع کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔"

۳۔ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں :

وعن مالک رحمه الله روایتان احداهما یضعهما تحت صدره والثانیة یرسلهما ولایضع اِحداهما علی الأُخری و هذه روایة جمهور اَصحابه وهی الاَشهر عندهم([8]) یعنی" امام مالک سے دو روایات نقل ہوئی ہیں ایک یہ کہ ہاتھ کو سینہ کے نیچے رکھیں دوسری یہ کہ ہر دو ہاتھ کھلے رکھیں اور ہاتھ کے اوپر ہاتھ نہ رکھیں۔اور یہی قول جمہور اصحاب کا ہے اور یہی اُن کے نزدیک مشہور ترین قول ہے۔ اس کے بعد نووی پھر لکھتے ہیں:وعن مالک رحمه الله اَیضاً استحباب الوضع فی النفل والارسال فی الفروض۔۔۔ یعنی امام مالک سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ نافلہ نماز میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھے اور واجب میں ہاتھ کھول کر نماز پڑھے۔۔۔"([9])

۴۔ مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئ

مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئ میں آیا ہے :مذہب امام مالک میں ارسال الیدین عزیمت اور قبض یدین فقط رخصت ہے۔([10])

ان عبارات واختلافات سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ تمام علمائے اہل سنت کے نزدیک ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا مستحب ہے نہ کہ واجب۔اور اصول فقہ میں مستحب کا مطلب واضح ہے یعنی؛ایسا فعل کہ جس کا انجام دینا ثواب رکھتا ہے لیکن اس کے ترک کرنے پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔اور یہ مکروہ کی ضد ہے پس علمائے اہل سنت کے نزدیک اگر کوئی بغیر ہاتھ باندھے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہے۔

۲۔امام مالک ارسال الیدین کے قائل ہیں۔اور یہ اُن کا مشہور مذہب ہے اسی لئے تمام مالکی حضرات نماز میں ارسال الیدین کرتے ہیں۔

۳۔امام اوزاعی تخییر کے قائل ہیں۔یعنی؛اُن کے نزدیک ہر دو عمل (قبض وارسال) جائز ہیں۔

۴۔امام شافعی بھی نماز میں ارسال الیدین کو جائز جانتے ہیں۔

۵۔ان عبارات میں تصریح کی گئی ہے کہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا، نمازی کے لئے سخت ہے اور ارسال الیدین سہل ہے اور ہم قائل ہیں کہ شریعت محمدیہؐ شریعت سہلہ ہے۔اور اس قول کے مطابق نماز میں ارسال الیدین، شریعت کے مطابق ہے۔

۶۔نیز یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا، حضور قلب اور خشوع وخضوع کے خلاف ہے اور ارسال الیدین کے ساتھ نماز رجوع قلب کے موافق ہے۔

۷۔ان عبارات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اکابر علماء واولیاء کے لئے قبض یدین بہتر ہے لیکن عام مسلمانوں کے لئے ارسال الیدین ہی بہتر ہے۔

۵۔ قبض یدین کی روایات اور علمائے رجال کی جرح

۱۔ حد ثنا قُتَيبَةُ حَدَّثَنَا اَبُوالْاَحْوَص مِنْ سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ عن قَبِيْضةَ بنِ هُلْبٍ عَنْ ابِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُؤَمَّنَا فَيَاخُذُ شِمَالَهُ بِيَمِيْنِهِ([11]) قتیبہ نے ابو الاحوص سے اُس نے سماک بن حرب سے اس نے قبیضہ بن ہلب سے اور اس نے اپنے باپ سے روایت کی ہے حضرت رسول اللہؐ ہم لوگوں کی امامت کرتے تھے پس بائیں ہاتھ کو داہنے ہاتھ سے پکڑ لیا کرتے تھے۔

جرح

عن سفيان: انه ضعيف، وقال جرير الضبى: اتيت سماكا فرايته يبول قائماً، فرجعت ولم اساله، وقال احمد (بن حنبل): سماک مضطرب الحديث،وقال النسائى: اذا انفرد بأصل لم يكن بحجة. اس روایت میں سماک بن حرب ہے جس کے بارے میں سفیان ثوری کہتے ہیں: وہ ضعیف تھااور جریر ضفی کا کہنا ہے: میں سماک کے پاس گیا، میں نے دیکھا وہ کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا لہٰذا میں لوٹ آیا اور اس سے کچھ نہیں پوچھا۔اور امام احمد بن حنبل کہتے ہیں: سماک مضطرب الحدیث تھااور امام نسائی نے کہا ہے کہ جس حدیث میں سماک اکیلا ہو وہ حجت نہیں ہے۔" ([12])

۲۔ حدثنا محمد بن محبوب حَدَّثَنَا حَفص بن غياثٍ عن عبد الرَّحمٰن بن اسحَقَ عن زِيَادِ بن زِيدٍ عن ابى جُحِيْفَةَ اَنَّ عَلِيًّا رضى الله عنه قَالَ مِنْ السُّنَّةِ وَضْعُ الكَفِّ فِى الصَّلَاةِ تَحت السُّرةِ.([13]) یعنی: محمد بن محبوب نے حفص بن غیاث سے اور اس نے عبدالرحمٰن بن اسحاق سے اور اس نے زیاد بن زید اور اس نے ابو جحیفہ سے نقل کیا ہے کہ علیؓ نے فرمایا: ہاتھ پر ہاتھ رکھنا سنت ہے۔(ناف کے نیچے۔

جرح

اس روایت میں محمد بن محبوب، قدری مذہب تھا اور حفص بن غیاث نقل حدیث میں بہت غلطی کیا کرتا تھا۔ اور عبد الرحمٰن بن اسحاق کو سب نے غیر معتبر کہا ہے۔ احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہ تھے۔ اس کی روایتیں بیہودہ ہوتی تھیں۔ لوگ اس سے حدیثیں نہیں لیتے تھے۔ ان کے غیر معتبر ہونے پر سب نے اتفاق کیا ہے۔ ([14])

۳۔ محمد بن قدّامه یعنی ابن اعین عن ابی بَدرٍ عن ابی طالوت عبدالسَّلام عن ابن جَریرٍ الضَّبیّ عَنْ ابِیْهِ قَالَ رَاَیْتُ عَلِیًّا رضی الله یَمْسِکُ شِمَالَهُ بِیَمِیْنِهِ عَلَی الرَّسْغِ فَوْقَهِ السُّرة([15]) یعنی: محمد بن قدامہ نے ابو بدر سے، اس نے ابو طالوت سے، اس نے ابن جریر ضبی سے اس نے اپنے باپ جریر سے روایت کی ہے کہ میں نے علی (رضی اللہ) کو دیکھا کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ کو داہنے ہاتھ سے ناف کے اوپر پکڑا کرتے تھے۔

جرح

اس روایت کے راوی ابو بدر شجاع بن ولید کو ابو حاتم نے لین الحدیث کہا ہے یعنی اُن کی حدیثیں ضعیف ہوتی تھیں اور کہا ہے کہ یہ اچھے آدمی نہیں تھے۔ ان پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ ([16])

۴۔ نَصْر بن علی اخبَرنا ابَوُ احَمْدَ عَنْ العَلَاء بن صَالِحٍ عَنْ رُزْ عَةَ بن عَبد الرحمن قال سَمِعْتُ ابن الزُّبَیْرِ یقول ضُفُّ القَدَمَیْنِ وَ وَضْعُ الیَدِ عَلَی الیَد مِنَ السُّنَّةِ. ([17]) یعنی: نصر بن علی نے ابو احمد سے، اُس نے علا بن صالح سے اس نے زرعہ بن عبد الرحمٰن سے روایت کی ہے کہ ہم نے عبد اللہ بن زبیر کو کہتے سنا ہے کہ قدموں کو برابر رکھنا اور ہاتھ کو ہاتھ پر رکھنا سنت ہے۔

جرح

اس روایت کا راوی نصر بن علی متہم ہے اور ابو احمد مجہول ہے۔ اور ناپسندیدہ روایات نقل کرتا تھا۔ علا بن صالح بھی غلط روایات نقل کرتا تھا۔ زرعہ کی حدیثیں باطل ہوتی تھیں۔ ([18]) اس کے علاوہ یہ روایت پیغمبر اکرمؐ سے نقل نہیں ہوئی بلکہ ابن زبیر کی اپنی رائے ہے۔ حالانکہ نقل ہو چکا ہے کہ ابن زبیر ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے۔ لہٰذا یہ روایت خود ابن زبیر کے عمل کے خلاف ہے۔ اور جب راوی کا عمل ہی روایت کے مخالف ہو تو اس کا عمل قابل اعتماد ہوتا ہے نہ اس کا قول۔ ([19])

۵۔ حدثنا محمد بن بَكَّارِ بن الرَّيَّانِ عَنْ هُشَيْمٍ بن بَشِيْرٍ عن الحجاج بن ابى زينَبَ عن ابى عُثْمانُ النَّهدِىَّ عن ابن مسعودٍ انَّهُ كَانَ يُصَلِىّ فَوَ ضَعَ يَدَهُ اليُسْرَى عَلَى الْيُمْنَى فَرَآهُ النَّبُّى صلى الله فَوَضَعَ يَدَهُ اليُمْنَى عَلَى اليُسْرَى. ([20]) یعنی: محمد بن بکار بن ریان نے ہیثم بن بشیر سے اُس نے حجاج بن ابی زینب سے اس نے ابو عثمان ہندی سے روایت کی ہے کہ ابن مسعود بایاں ہاتھ داہنے ہاتھ پر رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے تو سرور عالمؐ نے اُن کا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ دیا۔

جرح

اس روایت کا راوی محمد بن بکار مجہول ہے اور ہشیم تدلیس کرتا تھا، سفیان ثوری کا کہنا ہے: ان سے روایت نقل نہیں کرنی چاہیے۔ حجاج کو امام احمد بن حنبل و امام نسائی و دار قطنی نے غیر معتبر کہا ہے۔ ([21])

۶۔حدثنا مُسَدَّدٌ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوٰاحِدِ بن زِيٰادٍ عَنْ عبد الرحمٰنِ بن اسحَقَ الكوفِىّ عن سَيَّارِ ابى الحَكَمِ عَن ابى وَائِلٍ قال قال ابُوهُرَيْرَةَ اخْذُ الْاكُفَّ فى الصَلَاةِ تَحْتَ السُّرَةِ قال ابو داود: سمعت احمد بن حنبل يضعف عبد الرحمان ابن اسحاق الكوفى.([22]) یعنی: مسدد نے عبد الواحد بن زیاد سے ،اس نے عبد الرحمٰن بن اسحاق سے اور اس نے سیار ابو الحکم سے اور اس نے ابو وائل سے روایت کی ہے کہ ابوہریرہ نے کہا: ہاتھ کو ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھنا چاہیے۔ابو داود کا کہنا ہے: میں نے احمد بن حنبل سے سنا ہے کہ اُنھوں نے عبد الرحمان ابن اسحاق کوفی کو ضعیف قرار دیا ہے۔

جرح

اس کا راوی 'مسدد' حدیثوں میں بے پروائی کیا کرتا تھا اور عبد الواحد تدلیس کیا کرتا تھا۔اور عبد الرحمٰن بن اسحاق کی بے اعتباری کا بیان اوپر گذر چکا ہے۔([23]) نیز یہ روایت ، قول پیغمبر ؐ نہیں ہے بلکہ قول ابو ہریرہ ہے اور اس کا قول حجت نہیں۔

۷۔ابوثَوبَةَ حَدَّثنَا الْهَيْثُم يعنى ابن حميدٍ عن ثَورٍ عن سَلَيْمَانَ بن مُوْسَى عن طَاوُسٍ قال كَانَ رسول الله صلى الله يَضَعُ يَدُهُ اليَمْنَى على يَدَهِ اليُسرَى ثُمَّ يَشَدُّ بَيْنَهُمَا عَلَى صَدْرِهِ وَ هُوَ فى الصَّلاةِ. ([24]) یعنی: ابو ثوبہ نے ھیثم ابن حمید سے اور اس نے محمد ابن حمید سے اس نے ثور سے ،اس نے سلیمان بن موسیٰ سے اور اس نے طاوس سے روایت کی ہے کہ پیغمبر داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر رکھتے تھے۔

جرح

اس کے راوی کو خود ابو داود نے قدری مذہب کہا ہے اور ابو مسہر غسانی نے قدری اور غیر معتبر کہا ہے اور محمد بن حمید کو امام ابن حجر مکی نے تقریب میں غیر معتبر لکھا ہے۔اور امام ذہبی لکھتے ہیں : کہ یہ غیر معتبر اور نہایت درجہ جھوٹے تھے اور حدیثوں میں تصرف کیا کرتے تھے اور حدیثیں چُرایا کرتے تھے۔اس سے جھوٹا کسی کو نہیں پایا گیا۔ ([25])

۸۔حدثنا عبد الله بن مسلمة عن مالک عن اَبی حازم عن سهل بن سعد قال کان الناس یومرون اَن یضع الرجل الید الیمنی علی ذراعه الیسری فی الصلاة، قال اَبو حازم لا اَعلمه اِلا ینمی ذلک اِلی النبی الله صلی الله علیه وسلم ۔۔۔([26]) یعنی: عبد اللہ بن مسلمہ نے امام مالک سے اور اس نے ابو حازم سے اور اس نے سہل بن سعد سے روایت کی ہے کہ لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ نماز گذار، کو چاہیے کہ وہ اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے۔ابو حازم کا کہنا ہے : جہاں تک میں جانتا ہوں اس میں حضرت رسولؐ کی طرف اشارہ ہے۔

جرح

یہ روایت دو وجہ سے بے اعتبار ہے:ایک تو یہ کہ امام مالک جو اس روایت کے راوی ہیں خود اس کے خلاف عمل کرتے تھے۔یعنی امام مالک ارسال الیدین کرتے تھے اور اُن کا یہ عمل مشہور ہے۔۔علامہ محدث عبد القادر قرشی حنفی لکھتے ہیں:" جب راوی کا عمل اس کی روایت کے مخالف ہو تو اس کا عمل معتبر ہے نہ اس کی روایت۔" ([27]) نیز بظاہر یہ روایت قول پیغمبرؐ نہیں ہے بلکہ دوسروں کا فتویٰ ہے کہ جسے سہل بن سعد نے نقل کیا ہے اور ابو حازم نے جو خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ پیغمبر (ص) کی طرف اشارہ ہے ؛ہمارے لئے حجت نہیں ہے۔چونکہ حدیث کو حسی ہونا چاہیے نہ کہ اندازہ۔اس کے علاوہ روایت میں کوئی ایسا قرینہ نہیں ملتا کہ یہ پیغمبرؐ کی طرف اشارہ ہے۔

امامیہ کے نزدیک نماز کی حالت میں کتف یا تکفیر یا قبض یدین (ہاتھ باندھنا) نماز کے باطل ہو جانے کا موجب بنتا ہے۔فقط ایک صورت میں تکفیر جائز ہے اور وہ ہے تقیہ کی صورت۔یعنی انسان تقیہ کی حالت میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔اور اس مسئلہ کے بارے میں امامیہ فقہا کے اقوال انتہائی صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔یہاں پر چند قول نقل کیے جاتے ہیں اور اس کے بعد ارسال الیدین کی ادلہ نقل کی جائیں گی۔

ارسال الیدین فقہاء کے اقوال کی روشنی میں

شہید اول لمعہ میں شرائط نماز کے ذیل میں چھٹی شرط کے ضمن میں کہ جو نماز میں ترک ہونے والی چیزوں کے بارے میں ہے، لکھتے ہیں: والتكتف اِلاّ لتقية شہید ثانیؒ اس مسئلہ کی شرح میں لکھتے ہیں :و هو وضع اِحدى اليدين على اُخرى بحائل وغيره فوق السُرة وتحتها عليه وعلى الزند۔۔۔"([28]) شیخ طوسیؒ النھایہ میں لکھتے ہیں:ولا يجوز التكفير في الصلاة ، فمن كفر في صلاته مع الاختيار فلا صلاة له ۔فان فعله لِلتقية والخوف،لم يكن به باس. ([29]) اسی طرح شیخ کتاب الخلاف میں لکھتے ہیں: لايجوز ان يضع اليمين على الشمال، ولا الشمال على اليمين في الصلاة لا فوق السرة، ولا تحتها۔وقال الشافعي وابوحنيفة و سفيان واحمد واسحاق وابوثور وداؤد: ان مع اليمين على الشمال مسنون مستحب...فقالت الامامية:ان صلاته باطلة، فوجب بذلک الاخذ بالجزم۔ وروى حريز عن رجل عن ابى جعفر عليه السلام قال: قلت له: "فصلّ لربّک وانحر"، وقال: "النحر الاعتدال في القيام ان يقيم صلبه، وقال: لاتكفر انما يصنع ذلک المجوس." وروى محمد بن مسلم عن احدهما عليه السلام قال: قلت له الرجل يضع يده في الصلاة اليمنى على اليسرى، فقال:"ذلک التكفير لاتفعله." ([30])

صاحب جواہرؒ شرح کلمات شرایع میں لکھتے ہیں:

والقسم (الثانى لا يبطلها) اِلا فعله (عمداً) اختيارا (وهو) امور احدها: (وضع اليمين على الشمال)المسمى في النصوص و كتب بعض الاصحاب بالتكتيف والتكفير من العلج للملک بمعنى وضع يده على صدره والتطامن له،و الظاهر اَنه لا حقيقة له شرعية و ان كان قد يوهمه بعض العبارات،نعم ما تسمعه من الحكم الشرعى له اِنماوه على كل بعض اَفراده لا مطلق الخضوع و التطامن ۔۔۔و على كل حال فالمشهور بين الاصحاب نقلاً و تحصيلاً بل في الخلاف و الغنية والدروس وعن الانتصار الاجماع على عدم جوازه في الصلاة، بل لااَجد فيه خلافاً اِلا من الاسكافي فجعل تركه مستحباً و اَبى الصلاح ففعله مكروهاً. ([31])

امام خمینیؒ تحریر الوسیلہ میں لکھتے ہیں:

ثانيها:التكفير، وهو وضع اليدين على الاخرى نحوما يصنعه غيرنا، وهو مبطل عمداً على الاقوى لاسهواً، وإن كان الاحوط فيه الاعادة ولا باس به حال التقية. ([32])

آیت اللہ العظمیٰ خوئیؒ لکھتے ہیں: الثامن :التكفير، وهو وضع احد اليدين على الأُخرى،كما يتعارف عند غيرنا،فانه مبطل للصلاة اذاأتى به بقصد الجزئية من الصلاة واما اذا لم يقصد به الجزئية بل أتى به بقصد الخضوع والتادب فى الصلاة ففى بطلان الصلاة به اشكال و الاحوط وجوباً الاتمام ثم الاعادة، نعم هو حرام حرمة تشريعية مطلقاً،هذا فيما اذا وقع التكفير عمداً وفى حال الاختيار۔واما اذاوقع سهواً أو تقيةً۔۔۔فلا باس به.(33)

وضاحت

فقہائے امامیہ کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ چیزوں میں کہ جو نماز میں ترک ہونی چاہیں، ایک کتف یا تکفیر ہے۔ کتف (بروزن کَذِب) ہے۔ اور وہ ایک ہاتھ کا دوسرے ہاتھ پر رکھنا ہے یا ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا ہے یا بقول شہید ثانیؒ دونوں ہاتھوں میں سے ایک کی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی کلائی پر ناف کے اوپر یا نیچے رکھنے کا نام کتف ہے۔ اسے تکفیر بھی کہتے ہیں۔ اور یہاں اس سے خدا کی خاطر تواضع کی نیت سے نماز میں ہاتھ کو ہاتھ کے اوپر رکھنا مراد ہے۔ جیسا اہل سنت کرتے ہیں۔ اسے تکفیر کیوں کہتے ہیں؟ چونکہ لغت میں کسی کے سامنے سر جھکانے کو تکفیر کہا جاتا ہے اور اصطلاح میں اس کا وہی معنیٰ ہے جو کِتف کا ہے۔

ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں کہ وہ کس طرح رکھا جائے خواہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر ہو یا ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے ہاتھ کی کلائی پر ہو۔ نیز اس میں بھی کوئی فرق نہیں کہ ناف کے اوپر ہاتھ باندھے جائیں یا ناف کے نیچے چونکہ روایت میں تکفیر کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور وہ ان تمام کیفیات کو شامل ہے۔ یعنی نماز میں تکفیر جس طرح بھی ہو، اس سے نہی کی گئی ہے۔

تقیہ کی صورت میں تکفیر کا حکم

فقہائے امامیہ نے تقیہ کی صورت میں نماز میں تکفیر کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی اگر تقیہ کی شرائط پائی جائیں تو انسان ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ چونکہ کتف اہل سنت انجام دیتے ہیں اور اُن کے نزدیک مستحب ہے لہٰذا ہمارے فقہا نے تقیہ کی صورت میں اسے جائز قرار دیا ہے۔ البتہ اسی حد تک کہ جس سے تقیہ انجام پاجائے نہ اس سے زیادہ یعنی اگر ایک رکعت میں ہاتھ باندھنے سے تقیہ رفع ہو جاتا ہے اور دوسری رکعت میں تقیہ کی ضرورت نہیں رہتی تو اسی پہلی رکعت میں ہی ہاتھ باندھنے چاہیں دوسری میں تکفیر جائز نہیں۔ (34)

ادلۂ مسئلہ

ادلہ خاص: اس مسئلہ میں جو اہم ترین ادلہ بیان کی گئی ہیں وہ اجماع اور احادیث و روایات ہیں۔

اجماع: صاحب جواہر نے تکفیر کی حرمت کے بارے میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میں نے کسی کو اس مسئلہ میں مخالف نہیں دیکھا :و علی کل حال فا لمشهور بين الاصحاب نقلاً و تحصيلاً بل فی الخلاف و الغنيه والدروس وعن الانتصار الاجماع عليه عدم جوازه فی الصلاة ،بل لا اَجد فيه خلافاً اِلا من الاسكافی فجعل تركه مستحباً،و اَبی الصلاح ففعله مكروهاً ([35])

احادیث و روایات

ادلہ چہار گانہ میں سے اس مسئلہ کی اہم ترین دلیل روایات واحادیث ہیں ۔لہٰذا وسائل الشیعہ میں ایک مستقل باب بعنوان: عدم جواز التکفیر وھو وضع الیدین علی الأخریٰ فی الصلاۃ قائم کیا گیا ہے۔ ہم یہاں بطور نمونہ چند روایات نقل کرتے ہیں:

۱۔مَحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ بِاِسْنَادِهِ عَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ سَعِيدٍعَنْ صَفْوَانَ وَفَضَالَةَ جَمِيعاً عَنِ الْعَلَاء عَنْ مَحَمَّدُ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ احَدِهِمَاع قَالَ قُلْتُ الرَّجُلُ يَضَعُ يَدَهُ فِي الصَّلَاةِ وَحَكَى الْيُمْنَى عَلَى الْيُسْرَى فَقَالَ ذَلِكَ التَّكْفِيْرُ لاَ تَفْعَلْ([36])

۲۔ مَحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ بِالاِسْنَادِ السَّابِقِ عَنْ زُرَارَةَ عَنْ ابِي جَعْفَرٍع قَالَ وَعَلَيْكَ بِالاِقْبَالِ عَلَى صَلَاتِكَ اِلَى انْ قَالَ وَ لَا تَكَفَّرْ فَاِنَّمَا يَفْعَلُ ذَلِكَ الْمَجُوسُ ([37])

۳۔وَعَنْ مَحَمَّدُ بْنِ يَحْيَ عَنْ احْمَدَ بْنِ مَحَمَّدٍ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ حَرِيْزٍ عَنْ رَجُلٍ عَنْ ابِي جَعْفَرٍع فِي حَدِيثٍ قَالَ وَ لاَ تَكَفَّرْ اِنَّمَا يَصْنَعُ ذَلِكَ الْمَجُوسُ ([38])

۴۔ عَبْدَاللهِ بْن جَعْفَرٍ فِي قُرْبِ الاِسْنَادِ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْحَسَنِ عَنْ جَدِّهِ عَلِيّ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ قَالَ اخِي قَالَ عَلِيُّبْنُ الْحُسَيْنِ ع وَضْعُ الرَّجُلِ اِحْدَى يَدَيْهِ عَلَى الْاخْرَى فِي الصَّلَاةِ عَمَلٌ وَلَيْسَ فِي الصَّلَاةِ عَمَلٌ([39])

۵۔ وَرَوَاهُ عَلِيّ بْنِ جَعْفَر فِي كِتَابِهِ نَحْوَهُ وَزَادَ وَ سَالْتُهُ عَنِ الرَّجُلِ يَكُونُ فِي صَلَاتِهِ اَيَضَعُ اِحْدَى يَدَيْهِ عَلَى الاخْرَى بِكَفِّهِ اوْ ذِرَاعِهِ قَالَ لَا يَصْلُحُ ذَلِكَ فَاِنْ فَعَلَ فَلَا يَعُودُ لَهُ([40])

۶۔ مَحَمَّدُ بْنَ عَلِيٌّ بْنْ الْحُسَيْن فِي الْخِصَالِ بِاِسْنَادِهِ عَنْ عَلِيّ ع فِي حَدِيثِ الاَرْبَعِمِائَةِ قَالَ لَايَجْمَعُ الْمَسْلِمُ يَدَيْهِ فِي صَلَاتِهِ وَهُوَ قَائِمٌ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ عَزَّوَجلَّ يَتَشَبَّهُ بِاهْلِ الْكُفْرِ يَعْنِي الْمَجُوسَ (41)

روایات کا خلاصہ

ان روایات میں نماز کی حالت میں تکفیر کی نہی کی گئی ہے اور اس عمل کو مجوس اور کفار سے تشبیہ دی گئی ہے لہٰذا ان روایات کے مطابق فقہائے امامیہ نے نماز میں تکفیر کو حرام جانا ہے، کیونکہ یہ عبادت میں شامل نہیں بلکہ عبادت کے فاسد ہونے کا موجب بنتی ہے۔

ادلۂ عام

بعض علماء نے صلوٰۃ وعبادات کے باب میں مسئلہ تکتف کو روایات کے علاوہ دوسری ادلہ سے بھی رد کیا ہے۔ بعنوان تائید چند ادلہ یہاں نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ فطرت کا تقاضا

حکیم علی الاطلاق (خداوند متعال) نے اشرف مخلوقات یعنی انسان کو پیدائش کے وقت کھلے ہاتھوں کے ساتھ خلق کیا ہے اور یہ قانون فطرت اس بات کی دلیل ہے کہ ہر حال میں حتیٰ عبادت میں بھی انسان اپنے ہاتھوں کو کھلا رکھے مگر یہ کہ کسی خاص دلیل سے اس بات کے برعکس عمل ثابت ہو جائے۔

۲۔اجماع مسلمین

ہم نے اس سے پہلے اجماع امامیہ کو نقل کیا ہے لیکن ارسال الیدین، اجماع مسلمین سے بھی ثابت ہے۔ چونکہ ارسال الیدین کا مسئلہ نہ فقط ادلہ امامیہ سے ثابت ہے بلکہ اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں بھی ایسے قوی شواہد موجود ہیں کہ جن سے ارسال الیدین کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تمام مالکی حضرات نماز میں ارسال الیدین کرتے ہیں۔(42) اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد علامہ محمد معین لاہوری کتاب ''دراسات اللبیب'' میں لکھتے ہیں: ''تمام اہل مدینہ نماز میں ارسال الیدین کرتے تھے اور اجماع اہل مدینہ حجت ہے۔ چونکہ اہل مدینہ کے مقابلے میں غیر اہل مدینہ کی غیر صحیح روایات کچھ بھی قیمت نہیں رکھتیں۔

۳۔ ارسال الیدین کے جواز میں اہل تسنن کے اقوال وروایات

اہل سنت کی معتبر کتابوں میں ایسی روایات اور اقوال بھی نظر آتے ہیں کہ جو ارسال الیدین کے جواز کی

حکایت کرتے ہیں اور جن سے قول امامیہ کی تائید ہوتی ہے۔ جن کتابوں میں یہ اقوال اور روایات نقل ہوئی ہیں۔ ذیل میں اُن میں سے چند ایک کے نام ذکر کیے جاتے ہیں :

1. دراسات اللبیب، علامہ محمد معین دہلوی، چاپ لاہور، ص ۳۴۱، ۳۴۰، سال ۱۸۶۸م۔
2. میزان الکبریٰ، علامہ شعرانی، باب صفۃ الصلوۃ، ص ۱۳۰، ۱۴۱ الی ۱۳۸۔
3. شرح کنز الدقائق، قسمت اول، باب صفۃ الصلوۃ، ص ۳۱۔
4. شرح صحیح مسلم، نووی، ج ۱، ص ۱۷۳ چاپ لکھنو۔
5. عینی شرح کنز الدقائق، ص ۲۵۔
6. نیل الاوطار، علامہ شوکانی، ج ۶، ص ۵۷، ۵۶۔
7. فتاویٰ مولانا عبد الحہ فرنگی محلّی لکھنوی، ج ۱، ص ۲۵۳، ۷۶۔
8. تسہیل القاری شرح صحیح بخاری، باب الصلاۃ
9. مصنف ابن ابی شیبہ، باب الصلوۃ۔
10. فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۱، ص ۴۰۶۔ ج ۲، ص ۱۷۸

*****

حوالہ جات

1 ۔النساء/103۔

2 ۔البقرہ/45۔

3۔سفینۃ البحار، مادہ صلوٰۃ

4۔سورہ الغاشیہ، آیت 4،3۔

5 ۔الکہف: ۱۰۳۔۱۰۴۔

6۔فی اختلاف الائمۃ، ص38، طبع مصر۔

7۔میزان الکبریٰ، ج1، ص125۔

8۔شرح مسلم، ج4، ص114۔

9۔ایضاً۔

10۔مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئی، ج اول، ص186۔

11۔میزان الاعتدال، ج ۲، ص ۳۲۳، ش ۳۵۴۸۔

12۔سنن ابو داؤد، ج ا، ص ۱۷۵، باب وضع الیمین علی الشمال فی الصلاۃ

13۔میزان الاعتدال، ج2، ص547، ش4811، ج1، ص567 ش2160۔

14۔سنن ابو داود، ج ا، ص ۱۷۶ باب وضع الیمین

15۔میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۲۶۴، ش ۳۶۶۸

16۔سنن ابو داود، ج ا، ص ۱۷۵، باب وضع الیمین علی الیسری

17۔میزان الاعتدال، ج4، ص252، ش9039۔

18۔جواہر مضیہ، ج 2، ص447، چاپ دکن

19۔سنن ابو داود، ج1، ص175، باب وضع الیمین

20۔میزان الاعتدال، ج3، ص 492، ش 7276 نیز ج۔1، ص462۔

21۔سنن ابو داود، ج1، ص175، باب وضع الیمین

22۔میزان الاعتدال، ج4، ص96، ش8454، ج2، ص672۔

23۔سنن ابو داود، ج1، ص175، باب وضع الیمین

24۔ میزان الاعتدال، ج4، ص321، ش9298۔
25۔ صحیح البخاری، ج1، ص259، باب وضع الیمنی علی الیسری
26۔جواہر مضیہ، ج2، ص427، چاپ دکن
27۔ متن اللمعۃ الدمشقیۃ، ص31۔
28۔ شرح اللمعۃ الدمشقیۃ، ج1، ص235۔
29۔النھایہ۔ ص73۔
30۔الخلاف، ص۳۲۱
31۔جواہر الکلام، ج۱۱، ص۱۵
32۔ تحریر الوسیلہ، ج۱، ص۱۵۸
33۔ منھاج الصالحین، ج۱، ص۱۹۳
34۔ر۔ک اللمعۃ الدمشقیۃ، ج۱، ص۲۳۵
35۔جواہر الکلام، ج۱۱، ص۱۵
36۔وسائل الشیعۃ، ج۷، ص۲۶۶
37۔وسائل الشیعۃ، ج۷، ص۲۶۶
38۔وسائل الشیعۃ، ج۷، ص۲۶۶
39 ۔وسائل الشیعۃ، ج۷، ص۲۶۶
40۔ وسائل الشیعۃ، ج۷، ص۲۶۷
41۔ میزان الکبریٰ، ج۱، ص۱۳۸، شرح کنز الدقائق، باب صلوۃ ص۳۱
42۔دراسات اللبیب، ص۳۴۲

دُعائے ندبہ، اسناد اور تعلیمات کی روشنی میں

The Pray of *Nudbah* in the Light of its Resource and Teachings

حجۃ الاسلام سید حسنین عباس گردیزی

دُعا اور اس کی اہمیت

دعا کے لغوی معنیٰ بلانے اور پکارنے کے ہیں اور اصطلاح میں دعا کا مطلب اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجتیں طلب کرنا اور اس کی طرف توجہ کرنا ہے۔ دعا انسان کی فطری ضرورت ہے۔ انسان جب اپنے اندر غور کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو محتاج اور نیاز مند پاتا ہے۔ اب یہ کس سے اپنی حاجتوں اور ضروریات کو پورا کرنے کا سوال کرے؟ اللہ تعالیٰ کے سوا سب محتاج ہیں۔ لہٰذا اب انسان کو اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرنا چاہیے اور اُسی سے ہی اپنی حاجتیں طلب کرنی چاہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: يَاأَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ([1]) یعنی: "اے انسانو تم سب اللہ کے محتاج اور فقیر ہو اور اللہ بے نیاز اور قابل حمد و ثنا ہے۔ ایک اور جگہ پر ارشاد ہوا ہے: وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ([2]) یعنی: "اللہ بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو۔"

انسان جتنا اپنے اندر اللہ تعالی کی نسبت محتاجی کا احساس کرے گا تو وہ دعا کے ذریعے اتنا زیادہ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوگا۔ ضرورت اور اضطرار کے وقت انسان اللہ کی پناہ مانگتا ہے اور انسان کا اللہ تعالی سے یہ رابطہ طبیعی اور فطری ہے۔ اس کے برعکس جتنا انسان اپنے آپ کو بے نیاز محسوس کرتا ہے، وہ خدا سے دُور ہوتا ہے اور اس سے روگردانی کرتا ہے اور سرکش ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید یہ مطلب یوں بیان کرتا ہے: كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ ([3]) یعنی: "بے شک انسان سرکشی کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔"

اسلام نے دعا کی بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔ اس بارے میں قرآن اور حدیث میں کئی اہم نکات اور مطالب کا تذکرہ ہے۔ ارشاد رب العزت ہے: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ[4] یعنی: "جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں ان سے قریب ہوں، پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔ لہٰذا مجھ سے طلب قبولیت کریں اور مجھ ہی پر ایمان و اعتماد رکھیں۔ شاید اس طرح راہ راست پر آجائیں۔" اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے اس سے دعا کرتا ہے تو وہ سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔

یہ امر بندوں کو دعا کی ترغیب دلاتا ہے۔ اگر چہ دعا انسان کا اپنے رب سے اپنی حاجتوں کا طلب کرنا ہے لیکن اسے عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور اس سے روگردانی کو تکبر اور سرکشی سے تعبیر کیا گیا ہے۔قرآن فرماتا ہے:وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ([5])ترجمہ: "اور تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا اور یقینا جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔"اس آیت میں عبادات سے مراد دعا ہے۔ اس کے بارے میں صحیحہ زرارہ میں امام باقرؑ فرماتے ہیں:هو الدعا و افضل العبادة الدعا([6])''اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے اور دعا بہترین عبادت ہے۔''

دعا، یعنی بندے کا اپنے آپ کو اللہ تعالی کے سامنے پیش کرنا ہے اور یہی روح عبادت ہے۔ عبادت انسان کی غرض خلقت ہے۔ عبادت کی قدر و قیمت یہ ہے کہ یہ انسان کو اس کے رب سے مربوط کر دیتی ہے۔ عبادت میں اللہ تعالیٰ سے قصد قربت ہی اصل جوہر ہے۔ اس کے بغیر عبادت، عبادت ہی نہیں ہے۔ عبادت اصل میں اللہ تعالی کی طرف حرکت ہے اور اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔انسان کا اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہونا اور اس سے براہ راست مستحکم رابطہ ہے۔ دعا کے علاوہ کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو اس سے زیادہ انسان کو اللہ تعالی سے قریب کر سکتی ہو۔ سیف تمار فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے سنا۔ آپؑ نے فرمایا :علیکم بالدعا ء فانکم لاتتقربون بمثله ([7]) یعنی: "تمہیں دعا کی تاکید کرتا ہوں، خدا کے قریب کرنے میں اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔" دعا نہ صرف عبادت ہے؛ بلکہ روح عبادت ہے۔ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا : الدعا مخ العبادة ولایهلک مع الدعا احد ([8]) یعنی: "دعا روح عبادت ہے دعا کے ہوتے ہوئے کوئی بھی ہلاک نہیں ہوتا۔"

دعا کی افادیت کا ایک اور پہلو جو مذکورہ آیت میں بیان ہوا ہے یہ کہ اس کے قبول ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔فرمایا :ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ([9]) یعنی: "مجھ سے دُعا کرو میں قبول کروں گا۔" جب انسان کو قبولیت کا وعدہ دیا گیا ہے تو سرکش اور بدبخت کے علاوہ کوئی اس سے روگردانی نہیں کرے گا۔ قرآن کریم میں پروردگار نے اپنی بارگاہ میں حاضری کے لیے اپنے بندوں کے سامنے چار راستے رکھے ہیں جن میں دعا سب

سے اہم راستہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے : قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ[10] یعنی: "آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں تو پروردگار تمہاری پروا بھی نہ کرتا۔" یہ آیت بتارہی ہے کہ دعاؤں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نظر کرم فرماتا ہے بلکہ پروردگار عالم اپنے بندے کی دعا کا مشتاق ہوتا ہے۔

حضرت امام صادقؑ نے خدا کی بارگاہ میں حاضری کے ان چار راستوں کو بیان فرمایا ہے۔ آپ سے مروی ہے کہ: انسان کے لیے چار چیزیں انجام دینا اس کے حق میں مفید ہے اور اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ ان میں سے ایک ایمان اور دوسری شکر ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ آمَنْتُمْ[11] یعنی: "اگر تم شکر کرنے والے اور ایمان لانے والے بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نہیں کرے گا۔" تیسری چیز استغفار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ[12] یعنی: "اور اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نہیں کرے گا اگر یہ توبہ اور استغفار کرنے والے ہو جائیں۔" اور چوتھی چیز دعا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ[13] یعنی: "آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں تو پروردگار تمہاری پروا بھی نہ کرتا۔"[14]

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا: انّ اللہ عزو جل لیُوخّر اجابة المؤمن شوقا الی دعائه یقول صوتا احبّ ان اسمعه ([15])اللہ تعالیٰ مومن کی دعا کے شوق سے اسے دیر سے مستجاب کرتا ہے اور فرماتا ہے مجھے یہ آواز پسند ہے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: "احبّ الاعما ل الی اللہ عزّ وجل فی الارض الدعا ء یعنی: "زمین پر اللہ کا سب سے پسندیدہ عمل دعا ہے۔"([16]) دعا دو طرح سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے گھری ہوتی ہے۔ اللہ کی طرف سے دعا کی توفیق اور پھر اس کی قبولیت۔ یہ دونوں اللہ کی رحمت کے دروازے ہیں۔ جو بندے کے لیے دعا کرنے سے پہلے اور دعا کرنے کے بعد کھلتے ہیں۔ رسول خداﷺ سے مروی ہے: من فتح له منکم باب الدعا فتحت له ابواب الرحمة ([17]) یعنی: "تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل جائے اس کے لیے ابواب رحمت کھل جاتے ہیں۔"

دعا کی اہمیت میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب ہم قرآن مجید میں مختلف انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کو ملاحظہ کرتے ہیں ان دعاؤں سے جہاں خدا کی ان برگزیدہ ہستیوں کے مقام عبودیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی کرنے والے اور گڑگڑانے والے تھے، وہاں ہمیں دعاؤں

کا سلیقہ اور ادب وآداب بھی معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت آدمؑ کی دعا ہے: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ([18]) یعنی: "پروردگار! ہم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا ہے۔ اب اگر تو معاف نہ کرے اور رحم نہ کرے گا تو ہم خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔"

ائمہ طاہرینؑ سے منقول دعائیں

قرآن مجید کے علاوہ کتاب مقدس کے عہد قدیم میں کتاب زبور دعاء و مناجات پر مشتمل ہے۔ دین اسلام میں دعاؤں کی اہمیت وافادیت کئی پہلوؤں سے اجاگر ہوتی ہے۔ ہادیان برحق آئمہ معصومینؑ نے نہ صرف ان دعاؤں کے ذریعے سے اپنے رب سے راز و نیاز اور مناجات کی ہیں بلکہ توحید سے متعلق اعلیٰ معارف کو ان دعاؤں کے قالب میں بیان کیا ہے۔ ان کے ذریعے سے انہوں نے لوگوں کو ہدایت کی ہے۔ جب آئمہؑ پر ہر قسم کی پابندی تھی تو انہوں نے انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی انہی دعاؤں کے ذریعے کی ہے۔ آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی دعاؤں کا ایک عظیم ذخیرہ دین اسلام کے پاس موجود ہے۔

اس ذخیرے میں چودہ معصومینؑ کی اپنی دعا و مناجات جو وہ اپنے رب سے کرتے تھے اور وہ دعائیں جو انہوں نے مختلف مواقع پر اپنے اصحاب کو تعلیم فرمائی ہیں، شامل ہیں۔ امیر المومنینؑ علیؑ کی مناجات اور دعائیں ہوں، جیسے دعائے کمیل یا امام حسینؑ کی دعائیں جیسے دعائے عرفہ، یہ سب کی سب علم و معرفت کا عظیم خزانہ ہیں اور معرفت الٰہی کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہیں۔ دعاؤں کے اس سلسلہ میں حضرت امام زین العابدینؑ کی دعاؤں کا مجموعہ صحیفہ کاملہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسے زبور آل محمد (ص) اور انجیل اہل بیتؑ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے اس کے حکیمانہ ارشادات وبصائر موثر ادعیہ و اوراد اور دل نشین حکم ونصائح آسمانی صحیفوں کے اسلوب کے آئینہ دار اور ان کی تعلیمی روح کے حامل ہیں۔ چنانچہ صاحب ریاض السالکین نے بعض اہل عرفان کا یہ قول نقل کیا ہے :انها تجری مجری التنزیلات السماویة وتسیر مسیرالصحف الوحیة والعرشیة. یعنی: "یہ صحیفہ، آسمانی کتابوں کے اسلوب نمونہ ہے اور اس کا منہج وہی ہے جو وحیانی اور عرشی صحائف کا ہے۔"

ائمہ طاہرین کی دعاوں کے ذخیرے میں باقی آئمہؑ کی دعاؤں کے علاوہ حضرت حجۃ ابن الحسن امام صاحب العصر والزمانؑ کی دعائیں بطور خاص موجود ہیں۔ امام زمانؑ کے متعلق دعائیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ

دعائیں جو آپؑ سے نقل کی گئی ہیں۔ دوسری وہ دعائیں جو آپ کے بارے میں دیگر اماموں سے روایت کی گئی ہیں۔ایسی دعاؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔امام صادقؑ کی دعا۔ ([19])

۲۔دعائے غریق ۔([20])

۳۔ماہ مبارک رمضان میں واجب نمازوں کے بعد دُعا۔

۴۔دعائے عہد صغیر۔([21])

۵۔دعائے عہد۔([22])

۶۔دعائے نیمۂ شعبان۔([23])

۷۔ نماز عصر کے بعد کی دعا۔ ([24])

۸۔دُعائے ندبہ۔

آئمہ معصومینؑ کی دعائیں اگر ایک طرف آل محمدؐ کی فصاحت و بلاغت کی آئینہ دار ہیں تو دوسری طرف ان کی خصوصیات اور ذاتی کمالات کی بھی ترجمان ہیں۔ چنانچہ ان دعاؤں کے پرتو میں ان کی حیات طیبہ کے نقوش کو دیکھا جا سکتا ہے ۔دعاؤں کی اسی اہمیت کے پیش نظر آئمہؑ کے اصحاب، آئمہؑ سے مروی ادعیہ کو محفوظ کرنے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔آئمہ ہدیٰؑ اپنے اصحاب سے دعاؤں کے سلسلے میں جو کچھ وصیت فرماتے، وہ ان کو لکھنے کے بڑے پابند تھے۔ سید رضی الدین علی بن طاوؤس کتاب ''مہج الدعوات'' میں امام موسی بن جعفرؑ سے منسوب دعائے ''جوشن صغیر'' کو نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے صحابی ابو وصاح محمد بن عبداللہ بن زید النخشلی نے اپنے والد عبداللہ بن زید سے روایت کی ہے اس نے کہا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے خاندان کے افراد اور ان کے شیعوں پر مشتمل ایک خاص گروہ تھا جو امام علیہ السلام کی مجلس میں اپنے ساتھ غلاف میں بڑی نرم و نازک آبنوس کی تختیاں لے کر حاضر ہوا کرتا تھا۔ جب بھی آپ اپنی زبان مبارک سے کوئی جملہ ارشاد فرماتے یا کوئی حکم بیان کرتے تو یہ افراد اُسے لکھ لیا کرتے تھے۔ اسی بنیاد پر عبداللہ نے کہا: " ہم نے آپ کو دعا میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔" اور اس سلسلے میں مشہور و معروف دعا''جوشن صغیر''امام موسیٰ کاظمؑ سے نقل کی ہے۔([25])

اہل بیتؑ سے مروی دعاؤں کا عظیم ذخیرہ اور گراں بہا سرمایہ احادیث و روایات کی کتب میں موجود ہے۔

ان سب کا بنیادی ماخذ وہ چار سو بنیادی کتب ہیں جنہیں امام صادقؑ کے باوثوق اور قابل اعتماد شاگردوں نے تحریر کیا، انہیں ''اصول اربعماۃ'' کہا جاتا ہے۔اہل بیتؑ کا یہ عظیم علمی ورثہ جو ان اصول اربعماۃ پر مشتمل تھا اوران ہی میں دعاؤں کی کتب بھی شامل تھیں، زمانے کے حالات اور ظالم و ستمگر حکمرانوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا اور جب طغرل بیگ نے بغداد پر حملہ کیا اور متعدد کتب خانے جلادیے گئے تو اس عظیم علمی سرمائے کے ایک بڑے حصے سے ہم محروم ہو گئے ۔اس کے باوجود کچھ کتب خانے محفوظ بھی رہے۔ ان میں شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسیؒ اور ان کے استاد محترم شریف مرتضی ؒ کا کتاب خانہ قابل ذکر ہیں۔ اس حوالہ سے محقق بزرگ طہرانی اپنی کتاب الذریعہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

و بالجملة الاصول الدعائية التی كانت فی مكتبة شاپور بالعناوين العامة او الخاصة كافتها صارت طعمة للنار۔۔۔"([26]) یعنی: "الاصول الدعائیہ (دعاؤں کی بنیادی کتب) جو اصول اربعماۃ میں شامل تھیں، جو شاہ پور کتاب خانہ میں یا خاص عناوین کے تحت موجود تھے، یاقوت حموی کی تشریح کے مطابق سب کے سب جل کر راکھ ہو گئے لیکن ان میں سے جو کچھ ذاتی طور پر دوسروں کے پاس موجود تھے، محفوظ رہ گئے۔ادعیہ ،اذکار اور زیارتیں ہم تک اسی طرح پہنچی ہیں جس طرح ان اصول میں ذکر تھیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب خانہ کے جلائے جانے سے چند سال پہلے متعدد علمائے اعلام نے ادعیہ ، اعمال اور زیارتوں کی کتابیں تالیف کی تھیں اور جو کچھ ان ادعیہ اصول میں موجود تھا، اسے اخذ کر لیا تھا۔ ان اصول سے تالیف کی گئیں کتابیں کتاب خانے کے جلائے جانے سے پہلے جس طرح موجود تھیں، وہ بعد میں بھی موجود رہیں اور آج تک موجود ہیں جیسے شیخ یعقوب کلینی ؒ متوفی ۳۲۹ھ کی کتاب ''الدعا''، شیخ قولویہ متوفی ۳۶۰ھ کی کتاب 'کامل الزیارات'، شیخ صدوقؒ متوفی ۳۸۱ھ کی کتاب 'الدعا والمزار'، شیخ مفید ؒ متوفی ۴۱۲ھ کتاب 'المزار' اور شیخ کراجکی متوفی ۴۴۹ھ کی کتاب 'روضۃ العابدین'۔"

وہ دعائیہ مصادر جو ان قدیمی اصول سے اخذ کیے گئے، ان میں سے کتاب '' مصباح المتہجد'' جو شیخ الطائفہ ابو جعفرؒ متوفی ۳۶۰ھ ہجری کی تالیف ہے، انہوں نے ۴۰۸ھ میں بغداد میں آنے کے بعد ان قدیم اصول کو اخذ کیا جو کتاب خانہ شاہ پور اور کتاب خانہ شریف مرتضی میں موجود تھیں۔ انہوں نے احادیث احکام کے سلسلے میں ''تہذیب الاحکام'' اور "استبصار" تالیف کیں اور دعا و اعمال کے بارے میں ''مصباح المتہجد'' کے عنوان سے کتاب تحریر کی۔([27]) ان کے علاوہ دعاؤں کے کچھ ایسے ماخذ و مصادر بھی ہیں

جو ساتویں ہجری تک محفوظ رہے اور کرخ بغداد میں شاہ پور کتاب خانے میں جلنے سے بچ گئے اور وہ سید رضی الدین ابن طاوؤس (وفات ۶۶۴ھ) کے ہاتھوں میں آئے۔ وہ اپنی کتاب کشف المحجہ جسے انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے تحریر کیا۔ اس کی بیالیسویں فصل میں لکھتے ہیں :

" اللہ تعالیٰ عزوجل نے مجھے تمہارے لیے متعدد کتابیں لکھنے کا موقع فراہم کیا۔۔۔ اور اللہ سبحانہ نے مجھے "دعوات" کی ساٹھ جلدوں سے زیادہ جلدیں تحریر کرنے کی توفیق دی ہے۔ جب ابن طاوؤس نے کتاب مہج الدعوات تحریر کی تو ان کے پاس دعاؤں کی ستر سے زیادہ کتابیں موجود تھیں اور یہ ان کی زندگی کی آخری کتاب ہے۔ ایک اور کتاب "الیقین" میں وہ لکھتے ہیں میں نے اپنی زندگی کی اس آخری کتاب کو اس وقت تحریر کیا جب میرے پاس دعاؤں کی ستر کتابیں موجود تھیں۔ ([28]) جب ابن طاوؤس نے دعاؤں کے سلسلے میں اپنی بڑی کتاب "اقبال الاعمال" تحریر کی تو جبعی کے بقول ان کے پاس اپنی پندرہ سو کتابیں موجود تھیں اور یہ ۶۵۰ھ کی بات ہے جب ابن طاوؤس اقبال الاعمال لکھ کر فارغ ہوئے۔

احادیث ہوں یا دعائیں، اصحاب آئمہ اور علماء اعلام نے انہیں نقل کرنے میں خاص اہتمام کیا ہے۔ شیخ بہائی کتاب "التشمسین" میں بیان کرتے ہیں۔ "ہمارے بزرگوں سے یہ بات ہم تک پہنچی ہے کہ اصحاب اصول کی یہ عادت تھی کہ وہ جب بھی کسی امام (ع) سے کوئی حدیث سنتے تھے تو وہ اس حدیث کو اپنے اصول میں درج کرنے کے لیے سبقت کرتے تھے کہ کہیں وقت گزرنے کے ساتھ پوری حدیث یا اس کا کچھ حصہ فراموش نہ کر دیں۔ ([29]) لہٰذا یہ اصول علماء کے نزدیک مورد وثوق تھے۔ جب بھی وہ ان سے کوئی روایت نقل کرتے تھے تو اس کے صحیح ہونے کا حکم لگاتے تھے اور اس پر اعتماد کرتے تھے معصومینؑ سے مروی احادیث اور ماؤثورہ دعاؤں کے صدور کو ثابت کرنے کے لیے محدثین اور فقہائے اسلام نے متعدد اصول بیان کیے ہیں جن کی بنیاد پر احادیث اور دعاؤں کی سند کو جانچا جاتا ہے اور اسے غیر صحیح روایات سے تشخیص دیا جاتا ہے۔

انہی منقولہ دعاؤں میں سے ایک "دعائے ندبہ" ہے جس میں غیبت امام زمانؑ پر اظہار افسوس اور حجت الٰہی سے جدائی اور دوری پر نالہ فریاد اور گریہ وزاری ہے۔ علاوہ ازیں حاجات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ غیبت امام زمانؑ میں اس دعا کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ پوری دنیا میں اس دعا کو پڑھا جاتا ہے اور اس کی سند بھی معصوم علیہ السلام سے ہے۔ اس کے صدور اور مروی ہونے کے حوالے سے تحقیق کی گئی

ہے تا کہ اس پر اعتماد اور اطمینان میں اضافہ ہو۔ دُعاے ندبہ کو جن بزرگ علما اور محدثین نے نقل کیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

1: شیخ جلیل القدر ثقہ ابو جعفر بن حسین بن سفیان البزوفری نے کتاب "الدعا" میں نقل کیا ہے۔[30]

2: شیخ جلیل القدر ثقہ ابو الفرج محمد بن علی یعقوب بن اسحاق بن ابی قرہ قنانی جو شیخ نجاشی کے معاصر ہیں، نے اسے نقل کیا ہے۔ ([31])

3: شیخ محمد بن مشہدی نے "المزار" میں محمد بن ابی قرہ سے اور انہوں نے ابو جعفر محمد بن حسین بن سفیان بنروفری سے بیان کیا ہے اور انہوں نے اسے امام زمان علیہ السلام سے نسبت دی ہے ([32])

4: سید بن طاوؤس نے "مصباح الزائر اور اقبال الاعمال" میں بعض اصحاب کے ذریعے محمد بن علی بن ابی قرہ سے اور انہوں نے محمد بن حسین بن سفیان بنروفری سے نقل کرتے ہوئے اس دعا کو امام زمان علیہ السلام کی طرف نسبت دی ہے (۲)

5: علامہ مجلسیؒ نے اسے "بحار الانوار" اور کتاب "زاد المعاد" میں اس دعا کو بیان کیا ہے۔ "زاد المعاد" میں وہ فرماتے ہیں کہ دعائے ندبہ جو کہ عقائد حقہ اور غیبت امام زمانؑ پر اظہار افسوس اور حزن وملال پر مشتمل ہے، معتبر سند کے ساتھ امام جعفر صادقؑ سے نقل ہوئی ہے۔ ([33])

دعا کی سند

اس دعا کی دو سندیں ذکر ہوئی ہیں:

پہلی سند: اسے سید ابن طاوؤس نے اپنی کتاب "مصباح الزائر" میں بیان کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

ذکر بعض اصحابنا قال محمد بن علی بن ابی قر ہ نقلت من کتاب محمد بن الحسین بن سفیان البزوفری قدس سرہ دعا الندبہ وذکر انہ الدعاا لصاحب الزمان صلٰوت اللہ علیہ و یستحب ان ید عا بہ فی الاعیاد الاربعۃ وھو ---[34] ہمارے بعض اصحاب نے بیان کیا ہے کہ دعائے ندبہ کو محمد بن علی ابی قرہ نے محمد بن الحسین بن سفیان البنروفری قدس سرہ کی کتاب سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دُعا صاحب الزمان علیہ السلام کے لیے ہے اور مستحب ہے کہ اسے چاروں عیدوں (جمعہ، قربان، فطر، غدیر) کے دن پڑھا جائے۔

دوسری سند: اس سند کو علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں نقل کیا ہے جو مختلف کتب روائی میں ذکر ہوئی ہے: قال محمد بن المشهدی فی المزار الکبیر: قال محمد بن ابی قرة : نقلت من کتاب ابی جعفر محمد بن الحسین بن سفیان البنروفری ---([35]) محمد بن مشہدی نے اپنی کتاب "مزار کبیر" میں تحریر کیا ہے کہ محمد بن ابی قرہ نے کہا ہے کہ ابو جعفر محمد بن حسین بن سفیان بزوفری کی کتاب سے نقل ہوا ہے۔ ان دو اسناد میں ایک فرق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ پہلی سند میں جو کمزوری نظر آرہی ہے وہ دوسری سند میں نہیں ہے۔ جناب مشہدی بلا واسطہ کہتے ہیں کہ محمد بن علی ابی قرہ نے بیان کیا ہے کہ دعائے ندبہ جناب بزوفری کی کتاب سے منقول ہے جبکہ پہلی سند میں سید ابن طاوؤس فرماتے ہیں کہ ہمارے بعض اصحاب نے یوں کہا ہے۔ اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ علامہ مجلسیؒ دونوں اسناد کو بیان کرنے کے بعد یوں اظہار کرتے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ سید ابن طاوؤس نے بھی اس دعا کو جناب مشہدی سے نقل کیا اور بعض اصحاب سے مراد جناب مشہدی ہیں البتہ ایک اور بات بھی ہے اگر سید ابن طاوؤس نے ہے اور وہ یہ کہ جناب سید دعا کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ثم صل صلاة الزيارة وقد تقدم و صفها تم تدعو بما احببت فانک تجاب ان شاالله تعالیٰ([36]) یعنی: " اس کے بعد جس طرح پہلے بیان ہوا ہے نماز زیارت بجالاؤ اور پھر جو تم چاہو، مانگو ان انشاالله تعالیٰ حاجتیں قبول ہوں گی۔" جبکہ جناب مشہدی کی کتاب "مزار" میں اس نماز زیارت کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ خود سید ابن طاوؤس نے اپنی کتاب اقبال الاعمال ([37]) میں دعائے ندبہ کے بعد اس نماز کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جناب سید ابن طاؤس نے اپنی کتاب مصباح الزائر میں نماز زیارت کو بطور رجاء بیان کیا ہے۔ بہر حال اہل فن کے نزدیک جو سند زیادہ معتبر ہے وہ محمد بن مشہدی کی سند ہے جس کے بارے میں ہم مزید بحث کریں گے سب سے پہلے ہم کتاب "مزار کبیر" کا تعارف کراتے ہیں۔

کتاب مزار کبیر: محمد بن مشہدی کی یہ کتاب رسول خداؐ اور ان کی پاک وطاہر آل کے بارے میں منقولہ زیارتوں پر مشتمل ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں اس کتاب کو "مزار کبیر" کے نام سے یاد کیا ہے۔([38]) جس طرح علامہ طہرانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "الذریعہ" میں بیان کیا ہے([39]) اور "مستدرک الوسائل" کے خاتمے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کو محدث نوری نے اپنی کتاب مستدرک الوسائل کے ماخذ میں سے قرار دیا ہے۔([40]) مزار کبیر کے مقدمے کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ جناب مشہدی نے اس کتاب

میں فقط انہی روایات کو نقل کیا ہے جو سند کے اعتبار سے قابل اعتماد اور موثق راویوں سے منقولہ تھیں۔ (41) اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ سید ابن طاوؤس قدس سرہ نے نہ صرف اس کتاب کو مورد اعتماد قرار دیا ہے اور اس سے بہت ساری باتیں نقل کی ہیں؛ بلکہ اس کی مدح وستائش بھی کی ہے۔ (42)

محمد بن مشہدی کا تعارف

معجم الرجال میں آیت اللہ ابو القاسم خوئی کی عبارت سے جو انہوں نے شیخ حرّ عاملی سے نقل کی ہے، یوں ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن مشہدی، محمد بن علی بن جعفر ہیں (43) جبکہ محدث نوری مستدرک الوسائل کے خاتمے میں اس بارے میں لکھتے ہیں کہ محمد بن مشہدی سے مراد محمد بن جعفر بن علی جعفر المشہدی ہیں جنہیں "حائری" کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ وہ ان افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے ابو الفضل شاذان بن جبریل قمی سے روایت نقل کی ہے۔ اور ابو الفضل سے دو واسطوں سے شیخ مفید سے روایتیں نقل کی ہیں۔ (44) بہر حال محمد بن مشہدی سے مراد ان دونوں میں سے کوئی بھی ہوں، (محمد بن علی بن جعفر یا محمد بن جعفر بن علی بن جعفر المشہدی) یہ شخصیت قابل اعتماد، مورد وثوق واطمینان اور جلیل القدر ہیں جن کی توصیف اور مدح کتب رجال میں بیان ہوئی ہے۔ (45)

محمد بن ابی قرہ کا تعارف

ان کے بارے میں یہ کہنا کافی ہے کہ کتاب مزار کبیر کے مصنف کے مورد اعتماد راویوں میں سے ہیں۔ نجاشی نے ان کے بارے میں یوں کہا ہے: محمد بن علی بن یعقوب اسحاق بن ابی قرہ ابو الفرج القنائی الکاتب کان ثقة و سمع کثیر اً و کتب کثیر او کان یوردق لاصحابنا و معنا فی المجالس له کتب منها : کتاب عمل یوم الجمعه کتاب عمل الشهود کتاب معجم رجال ابی المفضل،کتاب التهجد، اخبرنی و اجازنی جمیع کتبه. (46) یعنی: "محمد بن علی بن یعقوب اسحاق بن ابی قرہ ابو الفرج القنائی جن کا لقب "کاتب" ہے، ثقہ اور مورد اعتماد شخص ہیں کہ ان سے سنی ہوئی اور تحریری چیزیں بہت زیادہ باقی ہیں، وہ ایسے شخص تھے کہ کتابوں کا ایک ایک ورق اصحاب امامیہ کے لیے پڑھتے تھے۔ وہ ہمیشہ محافل و مجالس میں ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ ان کی کتابوں میں سے کچھ یہ ہیں : عمل یوم الجمعہ، علم الشہور، معجم رجال ابی المفضل اور کتاب التہجد۔ نجاشی مرحوم آخر میں فرماتے ہیں کہ محمد بن ابی قرہ مجھ سے روایت نقل کی ہے اور مجھے اپنی تمام کتب کو آگے نقل کرنے کی اجازت دی ہے۔"

اس عبارت سے اور خاص طور پر 'کان یوردق لا صحابنا و معنافی المجالس "کے جملے سے واضح ہوتا ہے نیز" جمیع کتبہ" سے بھی واضح ہوتا ہے کہ نجاشی کے پاس ابن ابی قرہ کی کتابوں کو نقل کرنے کا اجازہ بھی تھا۔ اس بناپر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ یہ دونوں ہستیاں ایک دوسرے کی ہمعصر ہیں لیکن چونکہ نجاشی کے پاس ابن ابی قرہ کی کتب نقل کرنے کا اجازہ تھا، اس لحاظ سے وہ نجاشی کے مشایخ (استاد) میں حساب ہوتے ہیں۔

محمد بن حسین بن سفیان البزوفری

جس طرح آیت اللہ خوئی قدس سرہ نے اپنی کتاب معجم الرجال میں بیان کیا ہے کہ اس شخص کا ذکر دو طرح سے ہوا ہے: ا:۔ محمد بن حسین بن سفیان البزوفری ابو جعفر۔ ۲۔ محمد بن حسین البزوفری۔ (47) یہ ابو جعفر احمد بن ادریس کے شاگردوں میں سے تھے اور ان سے روایات نقل کی ہیں۔ محمد بن نعمان یعنی شیخ مفیدؒ نے محمد بن حسین بن سفیان بزوفری سے روایت نقل کی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ شیخ مفید کے مشایخ (استاد) میں سے تھے۔ اگرچہ محمد بن حسین بن سفیان بزوفری کے بارے میں رجال کی کتب میں کوئی خاص توثیق نہیں آئی ہے لیکن اس لحاظ سے کہ یہ ان افراد میں سے تھے جن سے شیخ مفیدؒ نے بہت زیادہ روایات نقل کی ہیں اور مختلف موارد میں اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے رضا اور رحمت طلب کی ہے۔

[لہٰذا] بغیر کسی شک وتردید کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ توثیق کے عمومی قواعد، ان کو بھی شامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ بزرگوں نے فن رجال کے ماہرین سے جو قواعد بیان کیے ہیں، ان میں سے ہے کہ اگر کوئی مشہور ومعروف شخصیت ہو، اس نے بہت زیادہ روایات بھی نقل کی ہوں اور دوسری طرف اس کے بارے میں قدح اور تضعیف بھی بیان نہ ہوئی ہو تو یہی امر اس کے حُسن ظاہر اور اس کے ثقہ ہونے کی علامت قرار پائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص گمنام نہیں ہے بلکہ مشہور ومعروف ہے۔ پس اگر ماہرین رجال اس کے حوالے سے کوئی عیب یا نقص جانتے تو وہ ضرور بیان کرتے۔ پس ثابت ہوا کہ اس دعا کا سلسلہء سند مورد اطمینان اور قابل اعتماد ہے۔

"انه الد عا لصاحب الزمان ﷺ" کی شرح ابن بزوفری دعائے ندبہ کو نقل کرنے سے پہلے لکھتے ہیں:

انہّ الدعا لصاحب الزمان صلوت الله علیه ویستجب ان ید عی به فی الاعیاد الاربعة۔۔۔(48)

یہ حضرت صاحب الزمانؑ کی دعا ہے اور مستحب ہے کہ اسے چار عیدوں (عید الفطر، عید قربان، عید غدیر،

اور جمعہ) کے دن پڑھا جائے۔ غور وفکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ انہ الدعا لصاحب الزمان صلوت اللہ علیہ کے جملے کے بارے میں دو احتمال ہیں:

ا۔ یہ دعا ایسی دعا ہے جو امام زمانہؑ سے صادر ہوئی ہے۔

۲۔ یہ دعا ایسی دعا ہے جو امام زمانؑ کے لیے صادر ہوئی ہے نہ یہ کہ یہ آپؑ کی طرف سے بیان ہوئی ہے۔

ابن بزوفری مزید فرماتے ہیں: ویستجب ان ید عی به فی الاعیاد الاربعة یعنی اس کا چار عیدوں کے دن پڑھنا مستحب ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ بزوفری کی نظر میں یہ دعا امام معصومؑ کے علاوہ کسی اور سے صادر نہیں ہوئی کیونکہ اصحاب امامیہ کبھی بھی کسی ایسی دُعا کے متعلق جو غیر معصوم کی دُعا ہو، یہ نہیں کہتے کہ مستحب ہے کہ اسے فلاں وقت پر پڑھا جائے۔ لہٰذا درج ذیل قرائن کی بناپر یہ احتمال باطل ہے کہ یہ دعا کسی غیر معصوم سے نقل ہوئی ہے اور کسی شیعہ عالم کی دُعا ہے:

ا۔ بیان ہوا ہے کہ "یستجب" یعنی: اس دعا کا پڑھنا "مستحب" ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معصوم کی طرف سے جاری ہونے والی دعا ہے کیونکہ کسی بھی فعل یا ذکر پر احکام خمسہ (واجب، حرام، مکروہ، مستحب، مباح) کا حکم لگانا امور توقیفیہ میں سے ہے جو صرف اور صرف معصوم ہی انجام دے سکتا ہے۔

۲۔ اس دعا کے پڑھنے کے لیے خاص وقت 'اعیاد اربعہ' بیان ہوا ہے اور غیر معصوم کی دُعا کبھی اس خصوصیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔

۳۔ علماء کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ جب بھی کسی دعا یا زیارت کو وہ خود بناتے اور بیان کرتے تو اس کی وضاحت کر دیتے تاکہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو۔ مثال کے طور پر شیخ صدوقؒ "من لایحضرہ الفقیہ" میں حضرت فاطمہ زہراؑ کی ایک زیارت بیان کرتے ہیں جو ان کی اپنی طرف سے تھی۔ زیارت نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اسے سفر حج میں مدینہ میں حضرت فاطمہ زہراؑ کی قبر کے پاس پڑھا لیکن میں نے اسے اس صورت میں روایات میں نہیں پایا۔ ([49])

یا پھر سید بن طاوٗس اپنی کتاب الاقبال الاعمال میں لکھتے ہیں: "یہ فصل ہے ان کے بارے میں جسے ہم نے خود بنایا ہے۔ یہ دعا ہے جو کھانا کھاتے وقت ہم ذکر کریں گے۔" ([50]) وہ مزید لکھتے ہیں جو کچھ شوال کے چاند دیکھنے کے وقت ذکر کیا گیا ہے، اسے ہم نے کتاب "عمل الشہر" میں اس دعا کے ساتھ ذکر کیا ہے جسے ہم نے خود بنایا ہے اور یہ دعا تمام مہینوں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ ([51]) اسی طرح اور موارد میں بھی

جہاں دعائیں ان کی اپنی جانب سے ہوتی تھیں، وہاں انہوں نے اس طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ([52])
ابن مشہدی کتاب ''المزار'' میں بیان کرتے ہیں۔ میں نے اپنی اس کتاب میں فنون زیارات سے ایسی روایات جمع کی ہیں جو قابل اعتماد اور ثقہ راویوں کے ذریعے سادات سے متصل ہیں۔ ([53])

اگر انه الدعا لصاحب الزمان ﷺ سے مراد خود صاحب الزمانؑ کی دعا ہو تو پھر اس صورت میں اسے امامؑ کی توقیعات میں شمار کریں گے جو بزوفری کے لیے جاری ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دعا کس معصوم امامؑ سے نقل ہوئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر واضح نہیں ہے کہ یہ دعا کس امام سے بیان ہوئی ہے۔ ابن بزوفری کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعا امام زمانؑ سے بیان ہوئی ہے۔ اب اس صورت میں ابن بزوفری نے کس طرح آپ کی جانب سے اسے نقل کیا ہے تو اس بارے میں دو احتمال ہیں:
اوّل، یہ کہ یہ دُعا حضرت صاحب الامرؑ کی توقیعات میں سے ہے جو ابن بزوفری کے لیے صادر ہوئی جیسا کہ شیخ مفید علیہ الرحمہ کے لیے توقیعات صادر ہوئی ہیں چونکہ ان کا زمانہ غیبت صغریٰ کے نزدیک ہے۔
دوّم، یہ کہ بزوفری نے اس دعا کو اپنے والد حسین بن علی بن سفیان سے نقل کیا ہے جو کہ چوتھی صدی ہجری کے بڑے بڑے علماء اور راویوں میں سے تھے۔ وہ نواب اربعہ کے واسطے سے خط و کتابت اور توقیع کے ذریعے امام زمانؑ سے مربوط تھے۔ اس دعا کو انہوں نے اپنی کتاب میں بیان کیا جو بعد میں ان کے بیٹے کے ہاتھ پہنچی۔ علامہ مجلسیؒ نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ یہ دعا امام جعفر صادقؑ سے نقل ہوئی ہے۔ ([54])
اگرچہ بعض افراد نے اس احتمال کو رد کیا ہے، اس بنا پر کہ اس دعا میں چند باتیں اور مطالب ایسے ہیں جو اس کے امام صادقؑ سے صادر ہونے کے منافی ہیں لیکن محققین پر واضح ہے کہ ان اشکالات کی توجیہ کی جا سکتی ہے کیونکہ اس قسم کی باتیں اور مطالب چند دیگر مقامات پر بھی امام صادقؑ اور دوسرے آئمہ ہدیٰؑ سے نقل ہوئے ہیں۔ ([55])

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دعائے ندبہ، معصوم امام سے نقل شدہ دعا ہے اور دعائے غیر ماثور نہیں۔ علاوہ ازیں جب ہم اس دعا کے مطالب پر غور کرتے ہیں تو روشن ہوتا ہے کہ یہ اعلیٰ وارفع مفاہیم اور روح پرور الفاظ اور نورانی و ملکوتی مطالب کسی معصوم سے ہی صادر ہو سکتے ہیں یہ چیز مزید تاکید کرتی ہے یہ دعا آئمہ ہدیٰؑ میں سے کسی ایک سے نقل شدہ ہے۔ دُعائے ندبہ اپنے مطالب اور مفاہیم کے

اعتبار سے اعلیٰ اور بہترین دعا ہے اسی لیے علماء اور محققین نے اسے اہمیت دیتے ہوئے اس پر حاشیے اور اس کی شرحیں لکھی ہیں۔اس میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔شرح دعائے ندبہ: تالیف ؛ صدر الدین محمد حسنی مدرس یزدی

۲۔عقد الجمان لندبۃ صاحب الزمان، الامیر از عبدالرحیم تبریزی کے قلم سے

۳۔وسیلۃ القربۃ فی شرح دعاء الندبۃ، شرح علی خوئی کے قلم سے

۴۔شرح دعائے ندبہ ملا محسن تربتی سبزواری۔

۵۔النخبۃ فی شرح دعاء الندبہ سید محمود مرعشی۔

۶۔شرح یا ترجمہ دعائے ندبہ سردار کابلی۔

۷۔معالم القربۃ فی شرح دعاء الندبۃ، محدث ارموی

۸۔وظائف الشیعۃ فی شرح دعاء الندبۃ، ادیب اصفہانی

۹۔کشف الکربۃ، محدث ارموی۔

۱۰۔نوید بامداد پیزوی، موسوی خرم آبادی۔

۱۱۔شرح وترجمہ دعائے ندبہ، محب الاسلام۔

۱۲۔نصرۃ المسلمین، عبدالرضا خان ابراہیمی۔

۱۳۔فروغ الولایۃ۔آیت اللہ صافی۔

۱۴۔الکمات النخبۃ۔عطائی اصفہانی،

۱۵۔رسالۃ حول دعاء الندبۃ۔محمد تقی تستبری۔

۱۶۔رسالۃ دعاء الندبۃ۔میر جہانی اصفہانی،

۱۷۔سند دعاء الندبۃ۔

۱۸۔شرحی بر دعائے ندبہ۔،علوی طالقانی۔

*****

حوالہ جات

1۔ سورہ فاطر، آیت ۱۵

2۔ سورہ محمد، آیت ۳۸

3۔ سورہ علق، آیت ۶۔۷

4 ۔ البقرہ: 186۔

5۔ سورہ مومن، آیت ۶۰۔

6۔ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج ۲، ص ۴۶۶ باب فضل الدعاء دار لکتب الاسلامیہ تہران ۱۳۶۵ ہجری شمسی

7۔ علامہ مجلسی، محمد اقر، بحار الانور، ج، ۹۳، ص ۲۹۳

8۔ علامہ مجلسی، محمد اقر، بحار الانور، ج، ۹۳، ص ۳۰۰

9۔ سورہ مومن، آیت، ۶۰

10۔ سورہ فرقان آیت۔ ۷۷

11 ۔ سورہ نساء ۱۴۷۔

12 ۔ انفال۔ ۳۳۔

13 ۔ فرقان ۷۷۔

14 ۔ علامہ مجلسی۔ محمد باقر، بحار الانوار۔ ج ۹۷۔ ص ۲۹۱

15۔ علامہ مجلسی۔ محمد باقر، بحار الانوار۔ ج ۹۷۔ ص ۲۹۶

16۔ حر عاملی، محمد بن حسن، وسائل الشیعہ، ج، ۴، ص، ۱۰۹۴ ح ۸۶۳۹

17۔ طباطبائی محمد حسین، المیزان، ج، ۲، ص، ۴۲، پر تفسیر در منثور

18۔ سورہ اعراف، آیت ۲۳

19۔ شیخ صدوق، محمد ابن بابویہ، کمال الدین، ص، ۳۴۲، علامہ مجلسی، محمد اقر، بحار الانوار، ج، ۵۲، ص، ۱۴۶، ح، ۷۰

20۔ علامہ مجلسی محمد باقر بحار الانوار، ج، ۵۲، ص، ۱۴۸، ح، ۲۳

21۔ علامہ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج، ۸۶، ص، ۶۱

22۔ کفعمی، ابراہیم بن علی، الابلد الامین۔ ص ۸۲ چاپ سنگی

23۔ فتی شیخ عباس، مفاتیح الجنان، ص ۱۶۶

24۔ علامہ مجلسی، محمد باقر بحار الانوار، ج، ۵۳، ص، ۱۸۷، ح، ۱۸

25۔ بن طاؤس، سید رضی الدین علی، مہج الدعوات، کتاب دعااور اہلبیتؑ، مؤلف، آیۃ اللہ محمد مہدی آصفی ناشر مجمع جہانی اہلبیتؑ، کی، صفحہ ۴۱۱ پر پر نقل ہوا ہے۔

26۔ آغابزرگ طہرانی محسن: الذریعہ الی تصانیف الشیعہ، ج، ۸، ص، ۱۷۴

27۔ آغابزرگ طہرانی محسن: الذریعہ الی تصانیف الشیعہ، ج، ۲، ص، ۲۶۵

28۔ آغابزرگ طہرانی محسن: الذریعہ الی تصانیف الشیعہ، ج، ۲، ص، ۲۶۴

29۔ آصفی، محمد مہدی: دعااور اہلبیتؑ۔ ص، ۴۱۲، مجمع جہانی اہلبیت ؑ ۲۰۰۶ء

30۔ بنروفری کی کتاب جس میں دعائے ندبہ نقل ہوئی ہے وہ دسترس میں نہیں ہے بلکہ صاحب مزار کبیر اور ابن طاؤس کی دسترس میں بھی نہیں تھی۔

31۔ ان کی کتاب بھی موجود نہیں ہے ابن طاؤس کی کتاب مصباح الزائر اور ابن مشہدی کی کتاب مزار کبیر میں اس دعا کو ان کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے

32۔ بن مشہدی۔ مزار کبیر، ص، ۵۷۳۔ دعا ۱۰۷

33۔ ابن طاؤس سید رضی الدین بن طاؤس: مصباح الزائر۔ ص ۳۳۴، نسخہ خطی، اقبال الاعمال، ص، ۲۹۵ سے ۲۹۹

34۔ علامہ مجلسی، محمد باقر: زاد المعاد۔ ص۔ ۳۹۴۔ تہران ۱۳۲۱

35۔ ابن طاؤس: سید رضی الدین علی بن طاؤس۔ مصباح الزائر ص، ۳۳۴، نسخہ خطی

36۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج، ۹۹، ص ۱۰۴ سے ۱۱۰ تک

37۔ ابن طاؤس سید رضی الدین بن طاؤس: مصباح الزائر۔ ص ۴۵۳

38۔ ابن طاؤس سید رضی الدین بن طاؤس: اقبال الاعمال۔ ج، ۱، ص ۵۰۴

39۔ علامہ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۹۹، ص، ۱۱۰

40۔ آغابزرگ طہرانی، محسن۔ الذریعہ الی تصانیف الشیعہ۔ ج۔ ۲۰، ص، ۳۲۴

41۔ حاجی نوری، میرزا حسین: مستدرک الوسائل، ج ۳، ص ۳۶۸

42۔ مزار کبیر۔ کے مقدمے میں خطبے کے بعد یوں تحریر ہے "فانی قد جمعت فی کتابی ھذا من فنون الزیارات المشاھد وماورد فی الترغیب فی المساجد المبارکات والادعیہ المختارات ۔۔۔ مما اتصلت بہ من ثقات الرواۃ السادات "مستدرک الوسائل ج، ۳، ص، ۳۶۸، اور الذریعہ ج ۲۰۔ ص ۳۲۴ سے نقل کی بناپر

43۔ حاجی نوری میرزا حسین۔ مستدرک الوسائل، ج ۳ ص، ج، ۳، ص، ۳۶۸،

44۔ خوئی، ابوالقاسم، معجم الرجال، ج ۱۷، ص، ۲۵۹

45۔ حاجی نوری میرزا حسین، مستدرک الوسائل، ج، ۳، ص، ۳۶۸

46۔ رضوانی، علی اصغر۔ موعود شناسی و پاسخ بہ شبہات، ص ۴۹۲، انتشارات مسجد جمکران ۱۳۸۴ ہجری، شمسی

47۔ نجاشی، احمد بن علی رجال النجاشی۔ ص ۲۸۳، جامعہ مدرسین ۱۴۰۷ ہجری
48۔ خوئی، ابوالقاسم، معجم الرجال، ج ۱۷، ص، ۹
49۔ ابن طاؤس سید رضی الدین بن طاؤس: مصباح الزائر۔ ص ۴۴۱
50۔ شیخ صدوق، محمد بن، من لایحضر الفقیہ ج ۲، ص ۵۷۲ ۵۷۴ اور علامہ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار ج، ۹۷، ص، ۱۹۶۔ ح، ۱۳،
51۔ ابن طاؤس سید رضی الدین بن طاؤس: اقبال الاعمال۔ ص ۱۱۵
52۔ بن طاؤس سید رضی الدین بن طاؤس: اقبال الاعمال۔ ص ۳۰۵
53۔ بن طاؤس سید رضی الدین بن طاؤس: مہج الدعوات۔ ص، ۳۴۸، ۳۳۶، ۳۰۲ اور الامان الاخطار، ص ۱۷
54۔ مشہدی، شیخ محمد بن جعفر بن علی مزار کبیر، ص، ۱۶
55۔ منتخب الاثر باب، ۳، فصل، ۱۰، ج، ۴، ص ۱۴۰

التبیان فی تفسیر القرآن
Al-Tibyyan fi Tafseer-il- Quran

حجۃ الاسلام سید رمیز الحسن موسوی

یہ تفسیر دنیائے اسلام کی عظیم اور گرانقدر علمی تالیفات میں سے ایک ہے اور قرآن کے متعلق مکتب اھل بیتؑ کے ایک عظیم سپوت کی اعلیٰ تحقیقی و علمی خدمت ہے جو معقول و منقول، اصول و فروع، ادب و نحو اور لغت و بلاغت کے تمام فنون و علوم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہر دور کے علم دوست اور قرآنی تعلیمات سے لگاؤ رکھنے والے افراد اور علماء کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ "تفسیر التبیان" کی اہمیت اس وجہ سے بھی بہت زیادہ ہے کہ یہ شیعہ کی پہلی علمی و جامع تفسیر ہے اور ایک ایسے عالم و مفسر کی تحریر و قلمی کاوش ہے جو تفسیر قرآن لکھنے اور ایک مفسر قرآن ہونے کی تمام علمی شرائط پر پورے اُترتے تھے۔

شیخ طوسی ایک ایسے مفسر ہیں کہ جو نحو و صرف، لغت، معانی و بیان، بدیع و کلام، فقہ اصول، علم حدیث، فلسفہ و منطق اور علم الہیات سے پوری طرح آگاہ تھے اور ایک مفسر کے لیے ان سب علوم پر مہارت تامہ رکھنا لازمی ہے اور شیخ طوسیؒ میں یہ مہارت بدرجہ اتم موجود تھی۔ لہٰذا اسی وجہ سے آج صدیاں گذر جانے کے بعد بھی "التبیان" اپنے علمی رعب و دبدبے کے ساتھ علمی حلقوں میں پہچانی جاتی ہے۔ اور ہر زمانے کے علماء اس تفسیر کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ علامہ طبری "کی جامع البیان" شیخ طوسی سے پہلے تنہا ایک ایسی تفسیر تھی کہ جس میں نقل روایات اور معانی و لغات کی وضاحت کے علاوہ روایات و اقوال کی تنقید اور تحلیل و تجزیہ پر بھی خاص توجہ دی گئی تھی لیکن "تفسیر التبیان" میں شیخ طوسیؒ پہلی بار تفسیر قرآن میں اقوال و روایات اور تفسیری آراء پر سنجیدگی کے ساتھ علمی انداز میں نقد و تحلیل کرکے تفسیر کو فقط نقل اقوال اور روایات کے دائرے سے باہر نکالتے ہیں کہ جو بعض اوقات باہمی تضاد پر مبنی ہوتی ہیں۔

لہٰذا شیخ پہلی بار اقوال و روایات کے تحلیل و تجزیے میں عقلانی روش اختیار کرتے ہیں اور روایات اور تفسیری اقوال کو عقل کی کسوٹی پر، پرکھتے ہیں۔(1) شیخ طوسیؒ کی "تفسیر التبیان کے بارے میں آغابزرگ تہرانی لکھتے ہیں: هو اولُ تفسير جمع فيه مؤلفه انواع علوم القرآن--- یعنی: "التبیان پہلی تفسیر ہے کہ جس میں اُس کے مؤلف نے علوم قرآن کی انواع واقسام جمع کی ہیں۔" اسی

طرح ''الفوائد الرجالیہ ''میں علامہ سید مہدی بحر العلومؒ لکھتے ہیں: ''اور تفسیر میں (شیخ طوسیؒ) کی کتاب التبیان ہے کہ جو تمام قرآنی علوم کی جامع تفاسیر میں انتہائی گرانقدر، عظیم اور بینظیر کتاب ہے۔"
شیخ طبرسی جو کہ خود مفسرین کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں، نے اپنی تالیف ''مجمع البیان '' میں اس بحر علم سے استفادہ کیا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ علامہ بحر العلومؒ مزید لکھتے ہیں: "اور شیخ محقق محمد بن ادریس متوفی ۵۹۸ھ جو کہ شیخ الطائفہ سے بہت سے (علمی موارد) میں اختلاف رکھتے تھے اور اُن کی بڑی بڑی آراء کو رد کرتے رہے۔۔ لیکن ''التبیان '' کے آگے وہ بھی خاموش ہو جاتے ہیں اور اُس کا علمی استحکام وبنیاد دیکھتے ہوئے اُس کی عظمت وشان کا اعتراف کرتے ہیں۔۔۔"([2])
عظیم مفسر قرآن شیخ طبرسی ''التبیان '' کے بارے میں یُوں اظہار نظر کرتے ہیں: ''تفسیر التبیان ایک ایسی کتاب ہے جس سے نور حق کی روشنی پھیل رہی ہے اور سچائی وصداقت کی خوشبو آتی ہے، جو نادر معانی اور اسرار کی حامل اور وسیع ادبیات ولغات پر مشتمل ہے۔اُس کے مؤلف نے مطالب بیان کرنے میں اُن کی تفسیر وتوضیح اور تحقیق وجستجو کے بغیر قناعت نہیں کی۔''تبیان ''ایک ایسی راہنما (کتاب) ہے کہ جس کے '' انوار '' سے میں نے استفادہ کیا ہے اور اُسی کی روش وطریقے پر اس کتاب (مجمع البیان) میں قدم اُٹھاتے ہوئے مطالب قلم بند کیے ہیں۔''([3])
اپنی اس تفسیر کے آغاز میں اس تفسیر کی تالیف کے علل واسباب اور اس میں اپنی روش کے سلسلے میں شیخ طوسیؒ لکھتے ہیں: ''جس چیز نے مجھے اس کتاب (التبیان) کی تالیف پر آمادہ کیا، وہ یہ تھی کہ میں نے اپنے قدیم وجدید اصحاب (علماوشیعہ) میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ جس نے کوئی ایسی کتاب فراہم کی ہو جو تمام قرآن کی تفسیر پر مشتمل ہونے کے علاوہ اُس کے تمام فنون اور معانی پر جامعیت کی حامل ہو۔ گذشتہ علماء میں سے بعض نے کچھ روایات کو مکمل کوشش وسعی کے ساتھ اور اُن کی توضیح وتفسیر کے بغیر (جہاں تک ہو سکا) کتب حدیث سے نقل کرکے جمع کیا ہے اور بعض دوسروں نے آیات کی تفسیر بھی کی ہے لیکن اُنھوں نے بھی طبری وغیرہ کی طرح معانی قرآن میں بات بہت طویل کرتے ہوئے اُس کے فنون کے بارے میں جو کچھ ہاتھ لگا، وہی نقل کر دیا ہے اور بہت سے دوسرے اصحاب نے اُن کے معانی کی وضاحت پر بھی اکتفا کرتے ہوئے اختصار کی راہ اپنائی ہے۔ باقیوں نے راہ اعتدال اختیار کرتے ہوئے جو کچھ سمجھے ہیں، نقل کر دیا ہے اور جسے نہیں جان سکے، اُسے چھوڑ دیا ہے۔ الزجاج اور فراء اور انہی جیسے دوسرے

نحویوں نے اپنی تمام تر سعی و کوشش قرآن کے نحوی ادبی اور صرفی ، پہلو پر صرف کر ڈالی اور متکلمین میں سے ابو علی الجبائی جیسے لوگوں نے قرآن کے کلامی مباحث پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی اور چند دوسرے افراد نے بعض دوسرے فنون کی جانب مائل ہوتے ہوئے بلخی وغیرہ کی طرح تفسیر میں نامناسب مطالب ـــــ مثلاً فقہی فروعات کی لمبی چوڑی ابحاث اور فقہاء کے اختلاف کو داخل کر دیا۔

اس سلسلے میں بہترین اور اچھی راہ اعتدال جن لوگوں نے اختیار کی وہ محمد بن بحر، ابو مسلم اصفہانی اور علی بن عیسی رمانی ہیں کہ اُن کی کتابیں اس علم (تفسیر) میں بہترین تالیفات ہیں لیکن وہ بھی کلام کو طول دیتے ہوئے بہت سی غیر ضروری چیزیں لے آئے ہیں جن کی احتیاج نہیں تھی۔ میں نے اپنے اصحاب (علمائے شیعہ) کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ عرصہ دراز سے ایک ایسی تفسیر کے خواہش مند تھے۔ کہ جو اعتدال کے ساتھ ساتھ تمام علوم وفنون قرآن مثلاً قرائت ، معانی آیات ، اعراب ، متشابہ آیات کے بیان، ملحدین کے اعتراضات کے جواب ، جبریوں اور باطل عقائد وافکار کے حامل فرقوں، مثلاً مشبہ ، مجبرہ اور مجسمہ جیسے گروہوں کے جوابات پر مشتمل ہونے کے علاوہ مذہب اہل بیتؑ کے فروع واُصول کے مطابق علماء کے آیات قرآن سے استدلال پر مبنی ہو اور میں انشاء اللہ اس مقصد کی خاطر قرآن کے فنون میں اختصار و ایجاز کے ساتھ (اس تالیف)کا آغاز کر رہا ہوں کہ جو نہ اس قدر طویل ہوگا کہ قاری کو تھکا دے اور نہ اس قدر مختصر کہ اُسے معانی و مطالب کے سمجھنے میں دقت ہونے لگے۔۔۔ اور خداوند سے مدد و ہدایت کا طلب گار ہوں کہ وہ ہمیں رشد وہدایت فرمائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ! "([4])

شیخ طوسیؒ اپنی روش تفسیر میں عقلی ادلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''آیات کی تفسیر میں مفسرین میں سے کسی ایک مفسر کی تقلید نہیں کرنی چاہیے بلکہ ایسے قول کو انتخاب کرنا چاہیے جس پر سب مفسرین کا اجماع قائم ہو اور اسی اجماع کی وجہ سے اُس قول کی پیروی لازمی ہو جاتی ہے چونکہ مفسرین میں سے کچھ کی روش قابل ستائش ہے جیسے ابن عباس ، الحسن ، قتادہ ، اور مجاھد وغیرہ ہیں اور کچھ مفسرین کی روش قابل مذمت ہے۔ مثلاً ابی صالح ، السدی ، اور کلبی وغیرہ۔ یہ تو پہلے طبقے کی بات تھی۔ رہی بات متاخرین کی تو ان میں سے ہر ایک نے اپنے ہی مذہب اور طریقے کو تقویت بخشی ہے اور اسی کی بنیاد پر آیات کی تاویل کی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید جائز نہیں بلکہ صحیح ادلہ کی جانب رجوع کرنا چاہیے، خواہ وہ صحیح دلائل عقلی ہوں یا شرعی مثلاً اجماع اور متواتر روایت کہ جن کی پیروی ضروری ہے۔ اس

سلسلے میں خبر واحد قابل قبول نہیں، خاص کر علم کے سلسلے میں۔ اور جب کبھی کسی آیت کی تأویل کے لیے لغت کی گواہی و شہادت ضروری ہو تو چاہیے کہ ایسی لغت کو قبول کیا جائے جو اہل لغت کے درمیان معروف ہو اور خبر واحد و نادر الفاظ کو خدا کی کتاب میں گواہ و شاہد کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیے چونکہ ان سے یقین و قطع حاصل نہیں ہو سکتا۔"([5])

تفسیر التبیان کی چند اہم خصوصیات:

ا۔ شیخ طوسیؒ کی تفسیر التبیان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آیات کی تفسیر میں عقلی ادلہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اور پہلی دفعہ اس تفسیر میں عقلی ادلہ وسیع پیمانے پر قرآنی معانی و مفاہیم کی تفسیر میں استعمال کی گئی ہیں جبکہ اس سے پہلے کے مفسرین فقط نقلی دلائل پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ لہٰذا شیخ نے قرآن کے معانی و مفاہیم کی توضیحات اور وضاحت اور مختلف نظریات و مذاہب کے شبہات و اعتراضات کو اور شیعہ امامیہ کے عقائد وافکار پر ہونے والے اشکالات کو عقلی ادلہ کے ساتھ رد کیا ہے اور بعض مفسرین کے کائنات کے بارے میں علمی مسائل میں غلط افکار کو بھی عقلی دلائل و براہین کے ساتھ رد کرتے ہوئے بہت سی خرافات و غلط نظریات کی قرآنی نقطہ نظر سے عقلی دلیل کے ساتھ تردید کی ہے۔

مثلاً ابو علی جبائی، زمین کی عدم کرویت کا معتقد تھا اور قرآن کی ایک آیت سے اپنے نظریے کی تائید میں استدلال کرتے ہوئے زمین کے کروی نہ ہونے پر دلیل قائم کرتا تھا۔ وہ یہ کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ: الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا[6] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کروی نہیں کیونکہ قرآن میں زمین کو فراش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا علی القاعدہ زمین کو منبسط اور پھیلا ہوا ہونا چاہیے نہ کہ کروی، کیونکہ "والکرۃ لاتکون مبسوطۃ" یعنی کرہ مبسوط نہیں ہوتا اور عقل بھی ان لوگوں کے عقیدے کی تائید نہیں کرتی کہ جو کہتے ہیں زمین کروی ہے۔ کیونکہ: لانّ الارض لایجوز انْ تکون کرویّۃ مع البحار فیھا چونکہ پانی اس جگہ ٹھہر سکتا ہے جو مسطح ہو نہ کہ کروی جگہ پر۔

پس زمین پر سمندر و بحر کا وجود دلالت کرتا ہے کہ زمین کروی نہیں بلکہ مسطح ہے۔ لیکن شیخ پانچویں صدی ہجری میں ابو علی جبائی کے اس نظریے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ان قول من قال الارض کرویۃ، معنا ہ ان لجمیعھا شکل الکرۃ یعنی: "جو زمین کے کروی ہونے پر قائل ہے اُس کی مراد یہ ہے کے

زمین جمعاً کرہ کی شکل میں ہے۔" اور پوری زمین کا کروی ہونا، اس چیز کے منافی نہیں کے اُس پر بحر و دریا نہیں بہہ سکتے۔ایک دوسرے مقام پر شیخ طوسیؒ، عقلی استدلال کے ساتھ بادلوں کے بخارات کے ذریعے زمین سے آسمان کی جانب جانے کو ممکن قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقلی و سمعی دلیل اس امر کے بارے میں مانع نہیں ہے۔([7])

۲۔ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ شیخ طوسیؒ نے التبیان میں صرفی و نحوی بحث بھی کی ہے اور بہت سے موارد میں اس بارے میں سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

۳۔ تفسیر التبیان کی ایک اور خصوصیت اس کی لغوی ابحاث ہیں اور کلمات کے درمیان فرق اور مختلف لغات و الفاظ کی تحقیق ہے جو کہ انتہائی قیمتی اور فائدہ مند ہے اور تفسیر کے محققین اور دینی طلاب کے لیے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

۴۔ ایک دوسری خصوصیت تفسیر التبیان میں امثال کا وجود ہے کہ بعض مقامات پر کسی آیۂ کے ذیل میں ایک مناسب مثال لاتے ہیں کہ جو مطلب کی وضاحت میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ مثلاً آیت: وَيَاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ [8] کے ذیل میں معنی جنت کے بیان کے ضمن میں لکھتے ہیں: الجنة هی بستان من بساتين الدنيا لان جنة الخلد لايصل اليها ابليس ووسوسته یعنی: "آیت میں وہ جنت سے مراد اسی دنیا کو لیتے ہیں اور اسی جہان کے باغوں میں سے ایک باغ کو جنت شمار کرتے ہیں چونکہ جنت خلد تک شیطان اور اسکے وسواس کی رسائی ناممکن ہے۔" نیز کلمہ زوج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "زوج تاء کے بغیر فصیح و افصح ہے اور مبرّد کے شعر سے مثال لاتے ہیں: "واراكم لدى المحاماة عندی مثل صوت الرجال للازواج" یہاں لفظ ازواج کو زوج کی جمع جانا گیا ہے۔"([9])

تفسیر التبیان کی طباعت

تفسیر التبیان کے نسخے ۱۳۶۵ھ تک مختلف کتابخانوں میں پراگندہ پڑے تھے۔ اس دوران آیت اللہ سید محمد حجت کوہ کمری نے ہمت کی اور ان اجزا کو یکجا جمع کیا اور چند علماء کے ذریعے تصحیح کے بعد التبیان دو بڑی جلدوں میں جن میں سے ایک تقریباً ۹۰۰ صفحات پر مشتمل تھی، ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوئی۔ تفسیر التبیان کی دوسری طباعت دس جلدوں میں ہے۔ یہ طباعت جناب احمد حبیب قصیر العاملی کی تحقیق و تصحیح

اور حواشی کے ساتھ ہوئی ہے اور جلد اول کے شروع میں علامہ محقق شیخ بزرگ آغا تہرانیؒ کے قلم سے مولف مرحوم کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

اس طباعت میں متن کی تصحیح و تحقیق کے علاوہ پُر ارزش حواشی کا اضافہ قابل قدر ہے کہ جن میں مواضع آیات، اشعار، نسخہ کا اختلاف اور بعض الفاظ کی لغوی وضاحت شامل ہے۔ ہر جلد کے آخر میں فنی فہرستوں کے اضافے نے اس کی طباعت کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ان میں کتاب میں مذکور احادیث کی فہرست اور اُن انتقادات واعتراضات کی فہرست بھی کہ جو شیخ طوسی نے اس کتاب میں مختلف مفسرین، متکلمین کے افکار و نظریات پر کئے ہیں۔ اس کے علاوہ امثال اور لغوی مباحث کی فہرست شامل ہے اور آخر میں دسویں جلد کے خاتمے پر اشعار کے قافیوں کی فہرست بھی دی گئی ہے کہ جو دس جلدوں میں آئے ہیں۔ تفسیر التبیان کی یہ قیمتی اور گرانقدر طباعت، " دار احیاء التراث العربی بیروت " کی جانب سے ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ حالیہ سالوں میں جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، ایران کی جانب سے بھی ایک شایان شان طباعت کا آغاز ہو چکا ہے کہ جس کی چند جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

*****

حوالہ جات

1۔ مجلّہ حوزہ، شمارہ مسلسل ۱۹، ص ۶۶۔
2 ۔ حیاۃ الشیخ طوسی از مقدمہ تفسیر التبیان، صفحہ ق۔
3۔ مجمع البیان، مقدمہ ج ۱، ص ۱۰۔
4۔ تفسیر التبیان، سر آغاز، ص ا۔
5۔ ایضاً، ج ۱، ص ۶۔
6 ۔ البقرہ: آیت ۲۲ ۔
7۔ دارۃ المعارف الاسلامیہ الشیعیہ، ج ۳، جز حادی عشر، ص ۶۰۔
8 ۔ البقرہ: ۳۵۔
9۔ مجلّہ کیھان اندیشہ، شمارہ ۱۲، ص ۸۰۔

علمائے امامیہ کی اردو زبان میں تفسیری خدمات

The Services of Imamia Scholars the Field of *Tafseer*

سید نثار علی ترمذی

تقریباً۲صدی قبل بر صغیر میں علمی ،ادبی ،اور دفتری زبان فارسی تھی اردو ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔ ہر پڑھا لکھا شخص فارسی بول، پڑھ اور لکھ سکتا تھا۔ اس لیے علمی کام فارسی زبان میں ملتا ہے جب اردو پروان چڑھنے لگی تو اہل علم دنیا نے بھی اسے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا کیونکہ اردو زبان کی تاریخ اتنی پرانی نہیں ہے اس لیے اس زبان میں تحریر شدہ کتاب کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہیں جتنا دیگر زبانوں میں کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔

تفسیر: لغت میں پردہ ہٹانے اور چہرہ کھولنے کو تفسیر کہتے ہیں جب کہ اصطلاحی معنی قرآن مجید کے معانی ومطالب نیز لغت و اعراب و نکات کو بیان کرنا تفسیر ہے۔ تفسیر کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ عربی متن کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ لفظی بھی ہو سکتا ہے اور بامحاورہ بھی۔ دوسرا ترجمہ کے ساتھ بعض آیات کی مختصر تفسیر یا وضاحت جسے حاشیہ کہتے ہیں۔ تیسرا ترجمہ کے ساتھ ساتھ آیات کی مکمل تشریح بھی کرنا جسے عرف عام میں تفسیر کہتے ہیں۔ ہمارے اس موضوع میں تینوں قسم کے تفسیر و تراجم شامل ہیں۔ بعض اہل نظر نے ترجمہ کو تفسیر میں شامل نہیں کیا لیکن عربی سے دوسری زبان میں ترجمہ کو تفسیر اس لیے قرار دینا چاہیے کہ اس میں قرآن مجید کے الفاظ سے پردہ اٹھا کر غیر عرب کو مطالب کے چہرے دکھائے جاتے ہیں ۔قرآن مجید کی مکمل تفسیر آج تک نہیں لکھی گئی۔ آیئے ہم ان تفاسیر کا جائزہ لیتے ہیں جو اردو زبان میں سر زمین پاک وہند پر لکھی گئیں۔ ان میں سے بعض عوام کی دسترس میں نہیں ہیں لیکن ارتقائی سفر میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انقلاب اسلامی کی برکات سے اہم تفاسیر کے اردو تراجم ہوئے جن کا مختصر سا تعارف بھی ہم پیش کریں گے۔ اگرچہ علماء کرام نے قرآن مجید کی متعدد سورتوں اور آیات کی تفسیر بھی کی ہے جو کہ کتابی صورت میں شائع بھی ہوئی ہے مگر طوالت موضوع کے خدشہ کے پیش نظر ان کا تذکرہ نہیں کیا جارہا۔

۱۔ توضیح مجید فی تنقیح کلام اللہ الحمید

تالیف و تفسیر : سید علی ابن سید ابن د لدار علی غفران؛ سال اشاعت :۱۲۵۷ھ لکھنو: توضیح مجید ،عارفانہ

وموالیانہ قسم کی تفسیر ہے۔ فضائل اہل بیتؑ کے اثبات واشارات پر گفتگو کی ہے۔

۲۔ کلام اللہ

ترجمہ : مولانا فرمان علی ؒ سن اشاعت : ۱۳۲۷ھ ؛ نور مطبع لکھنو: ترجمہ میں بکثرت الفاظ قوسین میں تحریر کیے گئے ہیں۔ جن میں اسے مختصر تفسیر کی حیثیت دے دی ہے اگرچہ عام طور پر اسے ترجمہ ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ و حواشی ،فہرست و عناوین مطالب اور عام فہم زبان کی بدولت بے حد پسند کیا گیا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع کر چکے ہیں

۳۔ تفسیر المتقین

مفسر ترجم : سید امداد حسین کاظمی؛ سن اشاعت :۱۳۸۱ھ انصاف پبلشنگ کمپنی لمٹیڈ لاہور :اس میں مفسر نے ترجمہ کے ساتھ تھوڑا مفصل حاشیہ تحریر کیا ہے۔ سلیس زبان اور اہل بیتؑ کی شان میں مناظرے کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۴۔ ترجمہ وحواشی وضمیمہ

قرآن مجید مفسر و مترجم مولانا مقبول احمد دہلوی؛ سن اشاعت : ۱۳۳۱ھ لکھنو۔ دراصل مجموعی طور پر یہ ایک تفسیر ہے۔ جسے اجزاء میں الگ الگ چھاپ کر یکسانیت ختم کر دی گئی۔ مثلاً بڑی تقطیع پر عمدہ کتابت۔ پھر بین السطور ترجمہ اور طویل حواشی نیز ان حواشی کی بقیہ عبارت کو بطور مستقل ضمیمہ کی صورت میں الگ سے شائع کیا گیا۔ ماضی بعید میں یہ ضمیمہ حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ بعد میں حاشیے سے بہت کچھ حذف کر کے ۱۹۲۵ء میں افتخار بک ڈپو لاہور سے شائع ہوا یہی ایڈیشن بار بار چھپتا رہا۔

۵۔ ضیاء القران

ترجمہ حواشی ،سید زیرک حسین امروہی۔ سن اشاعت : ۱۳۳۱ھ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ حواشی میں فضائل آئمہ کے علاوہ تعویذات وغیرہ درج ہیں۔ سورتوں وآیات کے فضائل اور ان کے مقررہ ترتیب سے پڑھنے پر عجیب و غریب اثرات درج ہیں۔ مصباح القران نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

۶۔ترجمہ و حواشی قرآن

از حاجی سید مجاور حسین رضوی سن اشاعت ۱۳۹۴ھ ؛ پیر کالونی کراچی۔ ۹۴۴ صفحات پر مشتمل شائع کیا گیا ہے بمعہ متن۔

۷۔توضیح القران

ترجمہ و حواشی مولانا محمد صادق؛ سن اشاعت : ۱۹۴۴ء ؛ مجاہد بک ڈپو لکھنو ۹۶۰ صفحات پر مشتمل متن وترجمہ و حواشی قرآن مجید ہے۔

۸۔عمدہ البیان

مفسر : مولانا الحاج دسید عمار علی سونی پتی فاضل لکھنو سن اشاعت ۱۲۹۰ھ مطبع پنجابی لاہور۔

۹۔فصل الخطاب

مفسر سید العلماء علی نقی نقوی؛ سن اشاعت ۱۴۰۲ھ ۔اس تفسیر کی پہلی جلد میں ثمر بک کشمیر (مقبوضہ) ہندوستان سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس جلد کو ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی نے 1986ء میں شائع کیا ۔ مگر ''مصباح القران ٹرسٹ ''لاہور نے مکمل تفسیر سات جلدوں میں شائع کی۔ سید العلماء کا ترجمہ بہت معیاری ہے مگر تفسیر ایک ''حاشیہ'' جیسی ہے۔اس کی اہمیت مفسر اور ترجمہ کی وجہ سے ہے۔

۱۰۔ تفسیر القرآن

مفسر مولانا ظفر حسن امروہی۔ سن اشاعت : ۱۴۰۳ھ ؛ شمیم بک ڈپو کراچی ۔ یہ تفسیر چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کی زبان عام فہم اور سادہ ہے مگر اسے زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

۱۱۔ تفسیر انوار النجف:

مفسر: علامہ حسین بخش جاڑا نجفی۔ مکتبہ انوارالنجف دریا خان ضلع بھکر۔ یہ تفسیر ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد مقدمہ پر محیط ہے جبکہ تیرہ جلدوں میں تفسیر قرآن مجید ہے۔ اس میں بہت زیادہ غیر ضروری مواد شامل کر دیا گیا ہے مثلاً اگر روزہ کے بارے میں آیت ہے تو صفحوں کے صفحے روزہ کے فقہی مسائل میں درج کر دیے ہیں لیکن اس کے باوجود اسے خاصی پذیرائی ملی۔

۱۲۔انوار القرآن

علامہ ذیشان حیدر جوادی ۔ اسے تنظیم المکاتب لکھنو اور مصباح القران ٹرسٹ لاہور نے شائع کیا۔ عربی

متن یکجا اور ترجمہ یکجا ہے۔ جبکہ اہم الفاظ اور آیت کی تشریح کی گئی ہے۔ زبان کی سادگی اور منفرد انداز کے حوالے سے امتیاز حاصل ہے۔

۱۳۔ تفسیر فیضان الرحمٰن

مفسر :علامہ محمد حسین نجفی۔ مکتبہ سبطین، سرگودہا۔ یہ چھ جلدوں پر مشتمل تفسیر ہے پہلے ایڈیشن میں بہت زیادہ اغلاط تھیں۔ مگر بعد ضروری اصلاح کے دوبارہ شائع کی گئی۔ صرف مفسر کے حلقہ اثر کے لوگوں میں معروف ہے۔

۱۴۔ تفسیر کوثر

علامہ شیخ محسن علی نجفی۔ جامعۃ اہلبیت ؑ اسلام آباد اور امامیہ پبلیکشنز لاہور نے شائع کیا۔ پہلے تو قرآن مجید بمع ترجمہ و حواشی طبع ہوا ہے جسے عوامی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اب تفسیر الکوثر کے نام سے تفسیر منظر عام پر آئی ہے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تازہ ہوا کا جھونکا ہے اور علامہ صاحب نے ایک فرض کفائی ادا کیا ہے۔

۱۵۔احسن الحدیث

ملک کے معروف مقرر مفسر طالب جوہری نے احسن الحدیث کے نام سے تفسیر تحریر کی ہے۔ جس کی اب تک دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دوسری جلد میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۹ تک کی تفسیر شامل ہے۔ اس تفسیر کو "باب العلم" نشاط کالونی آر۔اے بازار لاہور نے شائع کیا۔

فارسی سے اردو زبان میں تراجم:

گو کہ یہ موضوع ہماری اصل بحث سے مطابقت نہیں رکھتا مگر اس پر مختصر اظہار خیال اس خلا کو پر کرنے میں معاون ثابت ہوگا جو اردو زبان میں تفسیری مواد کی کمی سے پیدا ہوا ہے۔

۱۔ تفسیر نمونہ

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے ایران میں ایک ماڈل تفسیر بنام ''تفسیر نمونہ'' ایک اہل علم کی جماعت کے تعاون سے تحریر کی۔ اس کی ۲۷ جلدیں ہیں۔ ملک خداداد پاکستان کے معروف عالم دین علامہ صفدر حسین نجفیؒ نے اس کا ترجمہ کیا اور مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ اس تفسیر نے

اپنی مقبولیت کے ریکارڈ قائم کئے۔اس تفسیر نے مکتب تشیع کا سر فخر سے بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اسے بجا طور پر ''نمونہ'' کہا جاسکتا ہے۔اس تفسیر کو اب پندرہ جلدوں میں بھی شائع کیا گیا ہے۔

۲۔ تفسیر موضوعی

یہ بھی آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی ترتیب شدہ ہے۔اس کا ترجمہ بھی مولانا صفدر حسین نجفیؒ نے کیا۔ اس کی دس جلدیں ہیں۔اس میں مختلف موضوعات پر قرآنی آیات کی تفسیر کی گئی ہے۔

۳۔ تفسیر المیزان

عظیم مفسر اور فیلسوف آیت اللہ محمد حسین طباطبائیؒ کی مایہ ناز تفسیر ''المیزان'' جسے اہل علم نے بہترین تفسیر قرار دیا ہے۔اس کی دو جلدوں کا ترجمہ جناب حسن رضا الغدیری نے کیا ہے۔ یہ تفسیر بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ تفسیر نور

یہ استاد محسن قرائتی کی تحریر کردہ ہے جس کی سولہ جلدیں ہیں۔ اس کی پہلی چھ جلدوں کا ترجمہ مولانا محمد علی فاضل نے شائع کیا۔جب کہ چند سورتوں کا ترجمہ مولانا محمد علی ترمذی نے کیا ہے جنھیں ادارہ'' البیان'' نے شائع کیا ہے۔

۵۔ تفسیر راہنما

اس کی چھ جلدوں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے جسے ایران کے سابقہ صدر ہاشمی رفسجانی نے تحریر کیا ہے۔

نوٹ: اردو تفاسیر کا مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے ۔اگر اس کے علاوہ کوئی اور تفسیر موجود ہے تو اسے قارئین سامنے لائیں تاکہ ریکارڈ مکمل ہوسکے۔ پاکستان کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ ایک ایسی تفسیر قرآن مجید کی پیش کریں جو علاقے کے معروضی تقاضوں کے مطابق ہو اور جسے امت مسلمہ کے سامنے اپنے علمی تفاخر کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔

یکی از مطبوعات

نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) اسلام آباد

سادات کالونی، بارہ کہو، اسلام آباد فون، 051 2231937